سہ ماہی

صالحات

زیر سرپرستی
جاوید احمد غامدی

مدیر: نعیم احمد بلوچ

جلد:3 شمارہ:1 جنوری ۔ مارچ 2026ء

علم و آگہی اور شعور و تربیت

حضرت عیسیٰ تمام پیغمبروں میں واحد رسول ہیں جنھوں نے پہلا کلام والدہ کی معصومیت اور پاک دامنی کی گواہی کا کیا۔ یہ فضیلت سوائے سیدہ مریم کے دنیا کی کسی خاتون کے حصے میں نہیں آئی اور یہ سعادت عیسیٰ کے سوا کسی بیٹے کو نہیں ملی کہ جس کو پہلی وحی ماں کی پاک دامنی اور خدا کی توحید ثابت کرنے کے لیے کی گئی۔ اورانھوں نے یہ پیغام بھی دیا کہ میں اپنی والدہ کی عفت و پاکیزگی کا پہرے دار ہوں۔ اور جس طرح میری پیدایش ہر قسم کی آلودگی سے پاک اور بابرکت ہے، اسی طرح میری ماں کی عفت بھی ہمیشہ کے لیے محفوظ ہے اور میں اپنی پوری زندگی اس کی حفاظت کروں گا۔ ایسا نہ کر پایا تو میں سرکش اور بدبخت قرار پاؤں گا۔ سیدہ مریم کی ذات کی یہ عظمت قرآن کا خاص امتیاز ہے۔ (ام عیسیٰ سیدہ مریم علیہا السلام)

www.ghamidi.org

غامدی سینٹر آف اسلامک لرننگ، المورد امریکہ

علم و آگہی اور شعور و تربیت

سہ ماہی

صالحات

خواتین کے لیے

زیر سرپرستی
جاوید احمد غامدی
نگران: حسن الیاس

جلد: 3 شمارہ: 1 جنوری - مارچ 2026ء

مدیر: نعیم احمد بلوچ نائب مدیر: وجیہہ حسان واحدی

مجلس ادارت

ارم نبی، بینش سلیم، ثوبیہ نورین، غزل چودھری، نکہت ستار

مجلس مشاورت

کوکب شہزاد، منیزہ ہاشمی، نسرین آفتاب، بشریٰ اعجاز، ڈاکٹر عظمیٰ عثمان

www.ghamidi.org

غامدی سینٹر آف اسلامک لرننگ، المورد امریکہ

سہ ماہی
صالحات
خواتین کے لیے

علم و آگہی اور شعور و تربیت

زیر سرپرستی
جاوید احمد غامدی

نگران: حسن الیاس

مدیر: نعیم احمد بلوچ

فہرست مضامین

1۔ عدت کی پابندیاں: حکم کی حکمت اور دور جدید	استاد جاوید احمد غامدی	04
2۔ سفر میں خواتین کے لیے محرم کی ہمراہی کی شرط	نعیم احمد بلوچ	07
3۔ امریکی خاتون صدر-ایک ادھورا جمہوری خواب	مدیر کے قلم سے	10
4۔ ام عیسیٰ سیدہ حضرت مریم علیہا السلام	نعیم احمد بلوچ	12
5۔ عورت کی تادیب کا مخاطب: شوہر یا معاشرہ؟	محمد حسن الیاس	18
6۔ کرسمس کی مبارک باد اور ہمارا رویہ	کوکب شہزاد	23
7۔ طلاق کی حقیقت—جواز یا ممنوعات	فابیہ احسان	27
8۔ جب دل دروازے بنے!	نسرین خان	34
9۔ لڑائی جھگڑے	ثوبیہ نورین	40
10۔ دستک	نعیم احمد بلوچ	46
11۔ بیٹوں اور بیٹیوں کی تربیت کے پوشیدہ پہلو	ثوبیہ نورین	51
12۔ ماں	جاوید احمد غامدی	55
13۔ خاتونِ اسلام	ابن فضل	57
14۔ انگلش و نگلش	دانش ابراہیم انصاری، فابیہ احسان	59

تعلیم القرآن

استاد جاوید احمد غامدی
تسہیل: نعیم احمد بلوچ

عدت کی پابندیاں: حکم کی حکمت اور دور جدید

وَ الَّذِیْنَ یُتَوَفَّوْنَ مِنْكُمْ وَ یَذَرُوْنَ اَزْوَاجًا یَّتَرَبَّصْنَ بِاَنْفُسِهِنَّ اَرْبَعَةَ اَشْهُرٍ وَّ عَشْرًا فَاِذَا بَلَغْنَ اَجَلَهُنَّ فَلَا جُنَاحَ عَلَیْكُمْ فِیْمَا فَعَلْنَ فِیْۤ اَنْفُسِهِنَّ بِالْمَعْرُوْفِ ؕ اللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِیْرٌ ﴿البقرة ۲:۲۳۴﴾

ترجمہ

اور تم میں سے جو لوگ وفات پا جائیں اور اپنے پیچھے بیویاں چھوڑیں تو وہ بھی اپنے آپ کو چار مہینے دس دن انتظار کرائیں۔ پھر جب اُن کی عدت پوری ہو جائے تو اپنے حق میں دستور کے مطابق جو کچھ وہ کریں، اُس کا تم پر کوئی گناہ نہیں۔

بیوہ کی عدت میں عام مطلقہ کی نسبت سے یہ اضافہ اِس لیے ہوا ہے کہ اُس کو تو ایسے طہر میں طلاق دینے کی ہدایت کی گئی ہے جس میں شوہر سے اُس کی ملاقات نہ ہوئی ہو، لیکن بیوہ کے لیے اِس طرح کا ضابطہ بنانا چونکہ ممکن نہیں ہے، اِس لیے احتیاط کا تقاضا یہی تھا کہ دن بڑھا دیے جاتے۔ قرآن نے یہی کیا ہے اور مطلقہ کی نسبت سے اُس کی مدت ایک ماہ دس دن زیادہ مقرر کر دی ہے۔ مطلقہ اور بیوہ کے لیے عدت کا حکم چونکہ ایک ہی مقصد سے دیا گیا ہے، اور وہ یہ ہے کہ خاتون کے پیٹ کی صورت واضح ہو جائے۔ اس لیے جو مستثنیات یعنی ایکسپشنز طلاق کے حکم میں بیان ہوئے ہیں، وہ بیوہ کی عدت میں بھی اُسی طرح ملحوظ ہوں گے۔ چنانچہ ایسی بیوہ جس کے شوہر سے ازواجی تعلقات ہی قائم نہ ہوا اس کی کوئی عدت نہیں ہو گی اور حاملہ کی عدت بچے کی پیدایش کے بعد ختم ہو جائے گی۔ روایتوں میں ہے کہ ایک حاملہ کی

عدت بچے کی پیدایش کے بعد ختم ہو جائے گی۔ روایتوں میں ہے کہ ایک حاملہ عورت، سبیعہ رضی اللہ عنہا نے جب اپنا معاملہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پیش کیا تو آپ نے یہی فیصلہ فرمایا۔ (بخاری، رقم ۵۳۲۰)

اس کے علاوہ سورۃ الاحزاب میں ہے:

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا نَكَحْتُمُ الْمُؤْمِنٰتِ ثُمَّ طَلَّقْتُمُوْهُنَّ مِنْ قَبْلِ اَنْ تَمَسُّوْهُنَّ فَمَا لَكُمْ عَلَيْهِنَّ مِنْ عِدَّةٍ تَعْتَدُّوْنَهَا. (الاحزاب ۳۳: ۴۹)

ترجمہ

اے لوگو جو ایمان لائے ہو، جب تم مومن عورتوں سے شادی کرو اور ان کو چھونے سے پہلے انھیں طلاق دے دو تو تمھارے لیے ان پر کوئی عدت نہیں جسے پورا کرنے کے لیے تم ان سے کہو۔

عدت کی غیر شرعی پابندیاں

عام طور پر یہی سمجھا جاتا ہے کہ مطلقہ یا بیوہ خاتون کو عدت کے دوران اپنے گھر سے باہر نہیں نکلنا چاہیے اور اس دوران اپنے آپ کو سفید کپڑوں میں ملبوس رکھنا چاہیے۔ مزید یہ کہ ہمارے ہاں عام طور پر عدت شوہر کے گھر نہیں گزاری جاتی۔ اس ضمن میں درج ذیل نکات کو اچھی طرح سمجھ لینا چاہیے:

1۔ عدت کی اصل وجہ اس بات کا یقین حاصل کرنا ہے کہ آیا خاتون حاملہ ہے یا نہیں۔ خاوند کے خاندان کو تحفظ دینے کے لیے ضروری ہے کہ وہ عدت کی مدت کو پورا کرے۔ اوپر سورۂ احزاب (۳۳) کی آیت ۴۹ ’ فَمَا لَكُمْ عَلَيْهِنَّ مِنْ عِدَّةٍ تَعْتَدُّوْنَهَا ‘ (ان پر میں واضح طور پر اس حقیقت کو بیان کرتے ہیں کہ اگر حمل کا امکان ہو تو پھر شوہر کی طرف سے عدت کی پابندی کرنا بیوی کے لیے لازم ہے۔ لہٰذا اگر کوئی خاتون بچہ پیدا کرنے کی عمر سے گزر چکی ہو یا موجودہ سائنسی ذرائع سے یہ معلوم ہو جائے کہ یہ وہ حاملہ نہیں ہے تو اس کے لیے عدت گزارنے کی ضرورت نہیں ہے۔ چنانچہ اسی وجہ سے قرآن مجید نے ان نئی شادی شدہ خواتین کو عدت سے بری قرار دیا ہے جو شوہر کے قریب نہ گئی ہوں۔

2۔ عدت کے دوران کسی مطلقہ کو اپنا گھر چھوڑنا چاہیے اور نہ ہی شوہر اس بات کا حق رکھتا ہے کہ اسے اس کے گھر سے باہر نکالے۔ اکٹھے رہنے کے نتیجے میں یہ ہو سکتا ہے کہ یہ چیز دونوں کے لیے فائدہ مند ہو اور ان کے مابین صلح ہو جائے اور ایک خاندان ٹوٹنے سے بچ جائے۔ شوہر کا گھر چھوڑنے کا استثنا صرف اسی صورت میں ہو سکتا ہے جب بیوی

نے بدکاری کا ارتکاب کیا ہو۔ اس صورت میں نہ تو شوہر کے لیے مناسب ہے کہ وہ بیوی کو گھر میں رکنے پر اصرار کرے اور نہ ہی جس وجہ سے یہ حکم دیا جارہا ہے، اس کا مقصد حاصل ہو گا۔

3۔ جہاں تک عدت کی پابندی کا تعلق ہے تو اس حکم کی بنیاد ساری کی ساری اس وجہ سے ہے کہ بیوہ یا مطلقہ خاتون کے پیٹ میں جو بچہ ہے، اس کے حسب نسب کا تعین کیا جائے۔ اس ضمن میں کوئی بیوہ خاتون کسی بھی مقصد سے باہر جاسکتی ہے۔ چنانچہ اگر بنیادی مقصد فوت ہونے کا اندیشہ نہ ہو، وہ حج جیسی اہم دینی ذمہ داری پوری کرنے کے لیے بھی جاسکتی ہے اور تفریح کی غرض سے کسی پارک میں بھی جاسکتی ہے۔ دوسرے لفظوں میں وہ کوئی ایسا کام نہ کرے گی جس سے بچے کے نام و نسب میں کوئی شبہ پیدا ہو۔

4۔ عدت کا اپنا ایک تقدس ہے۔ اس دوران میں بیوہ خاتون کو وقار اور سادگی سے وقت گزارنا چاہیے۔ یہ اتنی فطری بات ہے کہ کسی بیوہ یا مطلقہ خاتون کو اسے بتانے کی ضرورت ہی نہیں۔

5۔ عام طور پر برصغیر پاک و ہند میں خاص طور پر بیوہ کی عدت پر جو پابندیاں لگائی جاتی ہیں، یہ ہندو معاشرت کی وجہ سے ہیں۔ افسوس کا مقام یہ ہے کہ یہاں کے علماء نے اسے شریعت کا تقاضا قرار دیا ہے جبکہ شریعت میں اس کا کوئی حکم کہیں بھی بیان نہیں ہوا۔ یہ سراسر ناجائز پابندیاں ہیں۔

نعیم احمد بلوچ

سفر میں خواتین کے لیے محرم کی ہمراہی کی شرط

عام طور پر ہمارے علماء کی یہی رائے ہے کہ خواتین کو شریعت نے اکیلے سفر کرنے سے روکا ہے۔ ضروری ہے کہ ان کے ساتھ محرم موجود ہو۔ چنانچہ دار الافتاء، جامعہ علوم اسلامیہ علامہ محمد یوسف بنوری ٹاؤن کا فتویٰ کچھ یوں ہے:

اگر عورت کا اپنے شہر یا علاقہ سے باہر سفر کا ارادہ ہو اور اڑتالیس میل (سوا ستتر کلومیٹر) یا اس سے زیادہ مسافت کا سفر ہو تو جب تک مردوں میں سے اپنا کوئی محرم یا شوہر ساتھ نہ ہو اس وقت تک عورت کے لیے شرعاً سفر کرنا جائز نہیں ہے، حدیث شریف میں اس کی سخت ممانعت آئی ہے۔ البتہ سفر شرعی سے کم مسافت کے سفر میں اگر فتنہ کا خوف نہ ہو تو اکیلے سفر کی گنجائش ہے۔ عمومی احوال میں بھی احتیاط کا تقاضا یہ ہے کہ اڑتالیس میل سے کم یا شہر کے اندر بھی بالکل تنہا سفر نہ کرے۔

اس فتویٰ کی بنیاد بخاری اور مسلم جو احادیث بیان کی جاتی ہیں، وہ یہ ہیں:

عن عبد الله بن عمر، عن النبي صلى الله عليه وسلم، قال: «لايحل لامرأة تؤمن بالله واليوم الآخر، تسافر مسيرة ثلاث ليال، إلا ومعها ذو محرم»". (الصحيح المسلم، 1/433، كتاب الحج، ط: قديمی)

حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایات ہے کہ رسولِ کریم ﷺ نے فرمایا: اللہ تعالی اور آخرت کے دن پر ایمان رکھنے والی عورت کے لیے یہ بات جائز نہیں ہے کہ وہ تین راتوں کی مسافت کے بقدر سفر کرے، مگر یہ کہ اس کے ساتھ اس کا محرم ہو۔

اسی طرح بخاری شریف کی ایک روایت ہے:

تعلیم الحدیث

عن ابن عباس رضي الله عنهما، أنه: سمع النبي صلى الله عليه وسلم، يقول: «لايخلونّ رجل بامرأة، ولا تسافرنّ امرأة إلا ومعها محرم»، فقام رجل فقال: يا رسول الله، اكتتبتُ في غزوة كذا وكذا، وخرجت امرأتي حاجةً، قال: «اذهب فحجّ مع امرأتك»". (صحيح البخاري (4/ 59)

عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ انہوں نے آپ ﷺ سے سنا کہ آپ ﷺ فرمارہے تھے: کوئی عورت کسی مرد سے تنہائی میں نہ ملے اور نہ کوئی عورت بغیر محرم کے سفر کرے، تو حاضرین میں سے ایک آدمی کھڑا ہوا اور اس نے کہا: اے اللہ کے رسول! میں نے فلاں جہاد کے سفر میں جانے کے لیے اپنا نام لکھوایا ہے، جب کہ میری بیوی حج کرنے جارہی ہے، تو آپ ﷺ نے فرمایا: جاؤ اپنی بیوی کے ساتھ حج کرو۔

ان احادیث کی تشریح کرتے ہوئے ڈاکٹر شہزاد سلیم لکھتے ہیں:

اس بات کو پیش نظر رہنا چاہیے کہ بہت سی احادیث ایسی ہیں جن میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے مسلمانوں کی مصلحت اور عمومی بھلائی کے لیے ہدایات دی ہیں اور یہ ہدایات شریعت کا کوئی حصہ نہیں۔ مزید برآں اس طرح کے احکام حالات سے مشروط ہوتے ہیں۔ اگر حالات تبدیل ہو جائیں تو اس طرح کی ہدایات کا حکم بھی تبدیل ہو جاتا ہے۔ چنانچہ عرب جیسے انارکی سے بھرپور معاشرے میں مسلمان خواتین کے سفر کو محفوظ بنانے اور ان کے کردار کو کسی بھی اسکینڈل سے بچانے کے لیے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے انھیں کسی محرم کے ساتھ سفر کرنے کا حکم فرمایا ہے۔ تمام وہ سفر جس میں خواتین کے لیے یہ اندیشے موجود ہوں، وہاں خواتین کو اپنے لیے کوئی بھی حفاظتی تدبیر اختیار کرنی چاہیے۔ جدید دور کے بدلے ہوئے حالات میں سفر کے ذرائع بہت مختلف ہوگئے ہیں۔ اب سفر کے ایسے ذرائع وجود میں آچکے ہیں جن میں ایک خاتون کی جان، مال اور آبرو کو تحفظ حاصل ہوتا ہے۔ چنانچہ اس صورت حال میں محرم کی کوئی ضرورت باقی نہیں رہتی۔ جہاں تک اس فیصلے کا تعلق ہے کہ اس کے لیے کون سا سفر ایسا ہوگا جس میں اس کی جان، مال اور آبرو کو تحفظ حاصل ہے تو اس کا فیصلہ خاتون کو اپنے حالات کو پیش نظر رکھتے ہوئے خود کرنا چاہیے۔

استاذ جاوید احمد غامدی کے نزدیک خواتین کا محرم کے بغیر سفر کرنا شرعاً حرام نہیں ہے۔ ان کی رائے کی بنیاد یہ ہے:

- نبی ﷺ کی جو احادیث ہیں جن میں محرم کے بغیر سفر سے روکا گیا، وہ اُس زمانے کے غیر محفوظ حالات کے پیشِ نظر تھیں۔
- ان احادیث کا اصل مقصد عورت کی حفاظت اور عزت ہے، کوئی دائمی اور مطلق پابندی لگانا نہیں۔

- اگر آج کے زمانے میں سفر محفوظ ذرائع سے ہو (جیسے جہاز، ٹرین، بس) اور عورت کی جان، عزت اور وقار محفوظ ہوں، تو محرم کے بغیر سفر جائز ہے۔

غامدی صاحب کی رائے کا خلاصہ ایک سطر میں یہ ہے کہ حکم کی اصل روح حفاظت ہے، محرم بذاتِ خود شرطِ حرمت نہیں۔

غامدی صاحب کے استدلال کا اصل نکتہ یہ ہے کہ یہ احادیث حرام یا حلال کا مستقل قانون بنانے کے لیے نہیں تھیں بلکہ یہ اُس دور کے حالات کے مطابق حفاظتی ہدایات تھیں اور یہی ان احکام کی اصل علت تھی۔ یہ علت ختم ہو جائے تو حکم ختم ہو جاتا ہے۔ اور یہاں علت تھی:

- غیر محفوظ سفر
- ڈاکو، اجنبی راستے
- تنہا عورت کے لیے خطرات

غامدی صاحب ایک اور اہم حدیث سے بھی دلیل لیتے ہیں: حضرت عدی بن حاتمؓ سے روایت ہے: نبی ﷺ نے فرمایا: ایک وقت آئے گا کہ عورت حیرہ سے مکہ تک اکیلی سفر کرے گی اور اسے اللہ کے سوا کسی کا خوف نہ ہو گا۔ (صحیح بخاری)

غامدی صاحب کہتے ہیں کہ اگر محرم کے بغیر سفر بذاتِ خود حرام ہوتا تو نبی ﷺ اسے مثبت پیش گوئی کے طور پر بیان نہ فرماتے۔ اس لیے ان احادیث کی درست تفہیم یہی ہے کہ ان میں خواتین کے لیے اکیلے حکم کی ممانعت نہیں ہے بلکہ محفوظ طریقے سے سفر کرنے کی تاکید ہے۔

قصہ مختصر

نعیم احمد بلوچ

امریکی خاتون صدر-ایک ادھورا جمہوری خواب

دنیا کی سب سے بڑی جمہوریت کہلانے والا ملک امریکہ، سائنسی ترقی، انسانی حقوق اور شہری آزادیوں کا علم بردار تو ہے، مگر ایک بنیادی سوال آج بھی اپنی جگہ قائم ہے:

آخر امریکہ کی ڈھائی سو سالہ جمہوری تاریخ میں آج تک کوئی خاتون صدر کیوں نہیں بن سکی؟

تدبر سے دیکھیں تو یہ سوال کسی آئینی رکاوٹ کا نہیں، بلکہ امریکی سماج، سیاست اور اجتماعی نفسیات کی ان پرتوں کا ہے جو بظاہر نظر نہیں آتیں، مگر فیصلوں پر گہرا اثر ڈالتی ہیں۔

امریکی سیاست کی بنیاد ایسے دور میں رکھی گئی جب قیادت کا تصور طاقت، جنگ اور مردانہ غلبے سے جڑا ہوا تھا۔ صدارتی منصب کو طویل عرصے تک ایک ایسے کردار کے طور پر دیکھا گیا جو بحران میں سخت فیصلے کرے، فوج کی قیادت کرے اور عالمی طاقت میں لیڈر شپ کا مظاہرہ کرے۔ یہ تصور اگرچہ کمزور ضرور ہوا ہے، مگر مکمل طور پر ختم نہیں ہو سکا۔

دوسری طرف، سماجی ماہرین کے مطابق امریکی ووٹر کا لاشعور آج بھی صنفی تعصب سے پوری طرح آزاد نہیں۔ خاتون امیدوار کے بارے میں یہ سوال بار بار اٹھایا جاتا ہے کہ آیا وہ عالمی سیاست کے دباؤ، جنگی حالات اور طاقت کے توازن کو سنبھال پائے گی یا نہیں—جبکہ یہی سوال مرد امیدوار کے لیے شاذ ہی زیرِ بحث آتا ہے۔

انتخابی نظام بھی اس مسئلے کو تقویت دیتا ہے۔ Electoral College جیسے پیچیدہ نظام میں روایت پسند اور قدامت پرست ریاستوں کو غیر متناسب اثر حاصل ہے، جہاں تبدیلی اور صنفی مساوات کے تصورات ابھی پوری طرح جڑ نہیں پکڑ سکے۔ یوں عوامی ووٹ میں برتری کے باوجود نتائج کا پلڑا کسی اور طرف جھک جاتا ہے۔

سیاسی جماعتوں کا کردار بھی قابلِ غور ہے۔ دونوں بڑی جماعتیں اکثر خاتون امیدوار کو “خطرناک تجربہ” سمجھتی ہیں اور محفوظ، آزمودہ راستہ اختیار کرتی ہیں۔ پارٹی قیادت، فنڈنگ اور تنظیمی ڈھانچے آج بھی بڑی حد تک مردوں کے زیرِ اثر ہیں، جس کا نقصان براہِ راست خواتین امیدواروں کو پہنچتا ہے۔

میڈیا کا رویہ اس عدم توازن کو مزید گہرا کرتا ہے۔ خاتون امیدوار کی گفتگو، لباس، آواز اور مزاج تک کو موضوعِ بحث بنایا جاتا ہے، جبکہ مرد امیدوار کے لیے اہلیت اور پالیسی کافی سمجھی جاتی ہے۔ ایک مرد امیدوار کو پُراعتماد کہا جاتا ہے، مگر وہی انداز کسی خاتون میں “سخت” یا “غیر فطری” قرار پاتا ہے۔

ہلیری کلنٹن کی مثال اس تضاد کی واضح علامت ہے۔ وہ تجربے، عالمی سفارت کاری اور عوامی ووٹ میں سبقت رکھنے کے باوجود صدارت حاصل نہ کر سکیں۔ ان کی شکست نے یہ حقیقت عیاں کر دی کہ محض اہلیت کافی نہیں، سماجی قبولیت بھی شرطِ اول ہے۔

تاہم یہ کہنا بھی درست نہیں کہ امریکہ ہمیشہ اس دائرے میں قید رہے گا۔ کانگریس، سینیٹ اور ریاستی سطح پر خواتین کی بڑھتی ہوئی نمائندگی اس بات کی نشاندہی کرتی ہے کہ تبدیلی کا عمل سست ضرور ہے، مگر جاری ہے۔ ممکن ہے کہ آنے والی دہائیوں میں یہ تاریخی خلا پُر ہو جائے۔

فی الحال، امریکہ کی جمہوریت کا یہ باب ایک سوالیہ نشان کے ساتھ کھلا ہے – ایک ایسا سوال جو صرف امریکہ ہی نہیں، بلکہ دنیا کی ہر جمہوریت سے یہ پوچھتا ہے کہ کیا قیادت واقعی صلاحیت سے مشروط ہے، یا اب بھی صنف کے ترازو میں تولی جاتی ہے؟

نعیم احمد بلوچ

ام عیسیٰ سیدہ مریم علیہا السلام

قرآن، بائیبل اور مذہبی روایت کی روشنی میں ایک علمی مطالعہ

حضرت مریم دنیا کی واحد خاتون ہیں جن کا ذکر محض عقیدت یا تقدیس تک محدود نہیں، بلکہ فکری، اعتقادی اور تہذیبی مباحث میں مرکزی حیثیت رکھتا ہے۔ یہ غیر معمولی امر ہے کہ ایک ایسی خاتون جو نہ نبی ہیں، نہ شریعت کی حامل، تین آسمانی مذاہب کے فکری بیانیے میں اس قدر نمایاں مقام رکھتی ہیں۔

قرآن مجید، بائیبل (عہدِ جدید) اور بعد ازاں مذہبی روایت—تینوں میں حضرت مریمؑ کی زندگی کے مختلف پہلو محفوظ ہیں، تاہم ان کی وفات کے بارے میں تینوں تقریباً یکساں خاموش ہیں۔ یہ مضمون اسی تناظر میں حضرت مریمؑ کی حیات، ان سے ولادتِ عیسیٰؑ سے متعلق الہامی بیانیے، اور پھر وفات کے باب میں پائی جانے والی اس غیر معمولی خاموشی کا تحقیقی مطالعہ پیش کرتا ہے۔

حنّہ کا مکالمۂ دعا—سیدہ مریم کی پیدائش

قرآن مجید حضرت مریمؑ کی کہانی کو اُن کی ذات سے نہیں، بلکہ ان کی والدہ حنّہ کے روحانی مکالمے سے شروع کرتا ہے۔ یہ اسلوب بذاتِ خود اس بات کی علامت ہے کہ قرآن کسی فرد کی عظمت کو اس کے سماجی مرتبے سے نہیں، بلکہ

اس کے باطنی انتخاب سے جوڑتا ہے۔

سورۂ آلِ عمران میں حنّہ کا مکالمہ یوں محفوظ ہے:

جب عمران کی بیوی نے کہا: اے میرے رب! میرے پیٹ میں جو کچھ ہے، میں نے اسے تیرے لیے نذر مانا، سو تو اسے مجھ سے قبول فرما، بے شک تو ہی خوب سننے والا، خوب جاننے والا ہے۔ (آلِ عمران:35)

یہ نذر اس دور کے مذہبی ماحول میں غیر معمولی تھی، کیونکہ عبادت گاہ کی خدمت عموماً مردوں کے لیے مخصوص تھی۔ چنانچہ یہی وجہ ہے کہ جب بچی پیدا ہوئی تو حنّہ نے حیرت اور احساسِ ذمہ داری کے ساتھ عرض کیا:

"اے میرے رب! میرے ہاں تو لڑکی پیدا ہوئی ہے... اور میں نے اس کا نام مریم رکھا، اور میں اسے اور اس کی اولاد کو شیطانِ مردود سے تیری پناہ میں دیتی ہوں۔"

یہ دعا دراصل آنے والے واقعات کی تمہید ہے۔ قرآن کے مطابق، اللہ نے اس نذر کو قبول فرمایا:

"پس اس کے رب نے اسے حسنِ قبولیت کے ساتھ قبول کیا، اور اسے بہترین نشوونما عطا کی۔ (اُس کے احساسات یہی تھے)، تاہم اُس کے پروردگار نے اُس لڑکی کو بڑی خوشی کے ساتھ قبول فرمایا اور نہایت عمدہ طریقے سے پروان چڑھایا اور زکریا کو اُس کا سرپرست بنا دیا۔" (آل عمران:37)

سورہ آل عمران کی آیت 44 میں ہے:

"یہ غیب کی باتیں ہیں، (اے پیغمبر)، جو ہم تمھیں وحی کر رہے ہیں، اور حقیقت یہ ہے کہ جب ہیکل کے خدام یہ فیصلہ کرنے کے لیے کہ اُن میں سے کون مریم کی سرپرستی کرے گا، اپنے اپنے قرعے ڈال رہے تھے تو تم اُس وقت اُن کے پاس موجود نہ تھے، اور نہ اُس وقت اُن کے پاس موجود تھے، جب وہ اِس معاملے میں ایک دوسرے سے جھگڑ رہے تھے۔"

قرآن مریمؑ کے بچپن اور جوانی کے بارے میں بھی خاموش نہیں، بلکہ ان کے روحانی مقام کو واضح کرتا ہے:

جب کبھی زکریاؑ ان کے پاس محراب میں داخل ہوتے تو ان کے پاس (حکمت خداوندی کا) رزق پاتے۔ (آل عمران 37)

یہی وہ مقام ہے جہاں سیدہ مریمؑ کا مقام محض ایک لڑکی سے بڑھ کر ایک منتخب ہستی کے طور پر قائم ہوتا ہے۔

حیرت انگیز طور پر بائیبل یا کسی یہودی لٹریچر میں ان واقعات کا کوئی ذکر نہیں ملتا۔ حالانکہ یہ واقعات سیدہ مریم کے بارے میں ان حقائق کو بیان کرتے ہیں کہ:

سیدہ مریم کی پیدائش ایک خاص مقصد کے لیے ہوئی تھی۔ اللہ تعالیٰ نے سیدہ کی پرورش اور تربیت کا خاص اہتمام کیا ۔ان کے لیے حضرت زکریا جیسی جیّد شخصیت کا انتخاب اللہ تعالیٰ نے کیا۔ وہ اگرچہ پیغمبر نہیں تھے لیکن انھیں ہیکل میں نمایاں منصب حاصل تھا۔ صاف ظاہر ہے کہ یہ اہتمام اس لیے کیا جارہا تھا کہ بنی اسرائیل کو سیدہ کے بارے میں ادنیٰ درجے میں بھی کوئی ابہام نہ ہو کہ وہ اخلاق اور بزرگی کے لحاظ سے ان کے ہاں کی سب سے معزز خاتون ہیں۔ اور وہ جو کچھ بھی کہیں گی، کریں گی، کسی شک وشبہے کے بغیر درست وگا۔

یہ واقعہ بائیبل میں موجود نہیں البتہ کچھ غیر مصدقہ صحائف میں ضرور موجود ہے اور یہ اس بات کی دلیل ہے کہ اس واقعے کو چھپایا گیا ہے۔

فرشتے کی بشارت — قرآن اور بائیبل کا تقابلی بیان

قرآن کے مطابق، فرشتے مریمؑ سے مخاطب ہوتے ہیں:

”اے مریم! اللہ نے تمہیں چن لیا ہے، تمہیں پاکیزہ کر دیا ہے، اور دنیا کی عورتوں پر فضیلت دی ہے۔“ (آل عمران 44)

پھر وہ غیر معمولی بشارت دیتے ہیں:

”اللہ تمہیں اپنی طرف سے ایک کلمے کی بشارت دیتا ہے، جس کا نام مسیح عیسیٰ ابنِ مریم ہو گا۔“ (آلِ عمران:45)

جب مریمؑ سوال کرتی ہیں کہ یہ کیسے ممکن ہے، تو جواب ملتا ہے:

”اللہ جو چاہتا ہے پیدا کرتا ہے، جب وہ کسی کام کا فیصلہ کرتا ہے تو کہتا ہے: ہو جا، سو وہ ہو جاتا ہے۔“ (آلِ عمران:47)

یہاں قرآن پوری وضاحت کے ساتھ عیسیٰؑ کی ولادت کو خالقِ مطلق کے ارادے سے جوڑتا ہے، نہ کہ کسی الوہی نسبت سے۔

بائیبل میں بشارت (Gospel of Luke)

انجیلِ لوقا میں یہی واقعہ نسبتاً تفصیل سے بیان ہوا ہے۔ فرشتہ جبرائیل مریم کے پاس آتا ہے اور کہتا ہے:

”مبارک ہے تو، جس پر خدا کا فضل ہوا۔“ (Luke 1:28)

پھر بشارت دیتا ہے:

”تو حاملہ ہو گی اور ایک بیٹے کو جنم دے گی، اور اس کا نام یسوع رکھے گی۔“ (Luke 1:31)

جب مریم سوال کرتی ہیں تو جواب آتا ہے:

”روح القدس تجھ پر نازل ہو گا، اور خدا کی قدرت تجھ پر سایہ کرے گی۔“(Luke 1:35)

یہاں قرآن اور بائیبل دونوں:

- کنواری ولادت پر متفق ہیں
- فرشتے کی بشارت پر متفق ہیں

اختلاف صرف تعبیرِ الٰہیات میں ہے، واقعے میں نہیں۔

حضرت عیسیٰ کی پیدائش پر سیدہ مریم کی کیفیت

قرآن میں سورہ مریم میں ہے:

سو مریم اُس بچے سے حاملہ ہو گئی اور (بیت المقدس سے نکل کر) اُس حمل کو لیے ہوئے، سب سے الگ ایک دور کی جگہ چلی گئیں۔ پھر (وہ وقت بھی آ گیا کہ) زچگی کی تکلیف اُسے کھجور کے تنے کے پاس لے آئی۔ (اُس وقت سخت بے بسی کی حالت میں) اُس نے کہا: اے کاش، میں اِس سے پہلے ہی مر جاتی اور بھولی بسری ہو جاتی۔ اِس پر مریم کے نیچے سے فرشتے نے اُس کو پکار کر کہا: غم نہ کرو، تمھارے پروردگار نے تمھارے پائیں سے ایک چشمہ جاری کر رکھا ہے۔ اور تم کھجور کے تنے کو اپنی طرف ہلاؤ، تمھارے اوپر تر و تازہ کھجوریں ٹپک پڑیں گی۔ سو کھاؤ پیو اور (بچے کو دیکھ کر) آنکھیں ٹھنڈی کرو۔ پھر کوئی آدمی دیکھو (کہ کچھ پوچھنا چاہتا ہے) تو اشارے سے کہہ دو کہ میں نے خدائے رحمٰن کے لیے روزے کی نذر مان رکھی ہے، اِس لیے آج میں کسی انسان سے کوئی بات نہ کروں گی۔ اِس کے بعد وہ بچے کو گود میں لیے ہوئے اپنے لوگوں کے پاس آئی۔ اُنھوں نے (دیکھا تو) کہا: مریم، تم نے یہ بڑی سنگین حرکت کر ڈالی ہے۔ اے ہارون کی بہن، نہ تمھارا باپ کوئی برا آدمی تھا اور نہ تمھاری ماں کوئی بدکار عورت تھی۔ اُس نے جواب میں بچے کی طرف اشارہ کیا (کہ وہی بتائے گا۔) لوگوں نے کہا: ہم اُس سے کیا بات کریں جو گود میں پڑا ہوا ایک بچہ ہے؟ بچہ بول اٹھا: میں اللہ کا بندہ ہوں، اُس نے مجھے کتاب عطا فرمائی اور مجھے نبی بنایا۔ اور جہاں کہیں بھی ہوں، مجھے سرچشمۂ خیر و برکت ٹھیرایا ہے۔ اُس نے مجھے ہدایت فرمائی ہے کہ جب تک میں زندہ رہوں، نماز اور زکوٰۃ کا اہتمام کروں۔ اور مجھے اپنی ماں کا وفادار بنایا ہے، مجھے سرکش اور بدبخت نہیں بنایا۔ اور مجھ پر سلامتی (کی بشارت) ہے جس دن میں پیدا ہوا اور جس دن مروں گا اور جس دن زندہ کر کے اٹھایا جاؤں گا۔ (مریمؑ 22۔33)

قرآن کے اس بیان سے بین السطور یہ حقائق اخذ کیے جاسکتے ہیں کہ:

جب ان کا ہیکل میں حمل ظاہر ہو گیا تو اس کا بھید کھلنے سے پہلے ہی وہ وہاں سے چلی گئیں۔ بائیبل کا بیان ہے کہ وہ بیت اللحم کے مقام پر گئیں۔ یقیناً انھیں وہاں پر کسی کی مدد حاصل ہو گی۔ یعنی سیدہ مریم نے خدا کی طرف سے کنواری ہونے کے باوجود ماں بننے کی آزمایش کو قبول کیا۔ کوئی ایسی حرکت نہیں کی ان کا حمل ضائع ہو۔ ان کو بتایا جا چکا تھا کہ ان کے پاس اللہ کی امانت ہے اور یہ امانت کوئی عام بچہ نہیں بلکہ اللہ کا پیغمبر ہے جس کی فضیلت بھی انہیں بتا دی گئی تھی۔ چنانچہ انھوں نے دل و جان سے اس کی حفاظت کی۔ جس کا طریقہ انھوں نے یہ اختیار کیا کہ بچے کی ولادت تک اپنے آپ کو لوگوں سے دور کر لیا تاکہ کسی بدمزگی کی صورت میں وہ بچے کو نقصان نہ پہنچائیں۔ یقیناً ان کے ساتھ ان کے کوئی ہم راز بھی ہوں گے۔ قرآن میں ذکر نہیں لیکن بائیبل میں اشارہ ہے کہ ان کے ساتھ انتہائی قریبی لوگ ساتھ تھے۔ البتہ قرآن کے آگے کے بیان سے واضح ہے کہ یہ راز عام لوگوں کے لیے ایک راز ہی رہا کہ وہ بچے کی ماں بننے والی ہیں۔ پھر انھوں نے زچگی کے لیے مناسب جگہ بھی سوچ رکھی تھی۔

اگلی تفصیل سے یہ اشارہ بھی ملتا ہے کہ یہ جگہ لوگوں سے پوشیدہ تھی۔ یہاں کھانے پینے کا کوئی انتظام نہیں تھا۔ اور قرآن کے مطابق وہاں ایک کھجور بھی تھی۔ جب پیدایش ہو چکی تو سیدہ کو تنہائی کا شدید احساس ہوا۔ آنے والے طوفان کو بھی وہ دیکھ رہی تھیں۔ اپنی حالت پر انھیں بہت دکھ ہوا کہ میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک بڑی آزمایش سے گزر رہی ہوں اور وہ بھی خفیہ طور پر تن تنہا۔ اسی لیے انھوں نے وہ جملہ کہا کہ یہاں تک نوبت آنے سے پہلے ہی کاش میرا خاتمہ ہو چکا ہوتا۔ تب سیدہ کی مدد کے لیے اللہ تعالیٰ نے فرشتے کو بھیجا تاکہ انھیں احساس ہو کہ اللہ تعالیٰ نے انھیں ہر گز اکیلا نہیں چھوڑا۔ فرشتے نے کہا آپ تنے کو جب ضرورت ہو، بس ہلائیں۔ یہ بھی واضح ہے انھیں اس کے لیے کسی خاص اہتمام کی ضرورت نہ تھی محض تنے کو اشارہ کافی تھا۔ ہو سکتا ہے اس وقت پھل کا موسم بھی نہ ہو اور سیدہ کو معجزاتی طور پر کھجوریں عطا ہوئی ہوں۔ اس رائے کو اس بات سے تقوت پہنچتی ہے کہ وہاں پر چشمہ بھی جاری ہوا۔ یقیناً اس جگہ چشمے کا ہونا ایک معجزہ ہی ہو سکتا ہے۔ اس قدر معجزاتی مدد اور وہ بھی اس شان سے یقیناً سیدہ کے لیے بہت حوصلہ افزا اور اطمینان بخش ہو گی۔ پھر ان کے دل میں پوشیدہ خوف کو بھی رفع کیا گیا۔ اور بتایا گیا کہ لوگوں کی باتوں کا کیسے مقابلہ کرنا ہے۔ انھیں فرمایا گیا کہ اب معاملے کو خفیہ رکھنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ آپ جب مناسب سمجھیں اپنے لوگوں میں جائیں۔ وہ پوچھیں تو روزے کا کہہ دیں۔ یاد رہے کہ تورات کی شریعت میں کھانے پینے کے ساتھ ساتھ خاموش رہنے کا بھی روزہ رکھا جا سکتا تھا۔ یہاں بھی سیدہ کا اپنے اللہ پر کامل بھروسا نظر آتا ہے۔ انھیں یقین تھا کہ

اللہ نے اگر بچے کی طرف اشارہ کرنے کا حکم دیا ہے تو ضرور کوئی بات ایسی ہو گی کہ میری پاک دامنی ثابت ہو گی اور ایسے ہی ہوا۔ چنانچہ جب سیدہ واپس ہیکل گئیں تو توقع کے عین مطابق لوگوں نے سوالوں اور طعنوں کی بوچھاڑ کر دی۔

جیسے ہی شیر خوار عیسیٰ کی طرف والدہ نے اشارہ کیا تو وہ وہ معجزانہ طور پر بول پڑے۔ اور ثابت کر دیا کہ ان کی پیدائش معجزہ ہے۔ اور وہ خدا کے بندے ہیں، کسی الوہیت کا مظہر نہیں۔

حضرت عیسیٰ تمام پیغمبروں میں واحد رسول ہیں جنھوں نے پہلا کلام والدہ کی معصومیت اور پاک دامنی کی گواہی کا کیا۔ یہ فضیلت سوائے سیدہ مریم کے دنیا کی کسی خاتون کے حصے میں نہیں آئی اور یہ سعادت عیسیٰ کے سوا کسی بیٹے کو نہیں ملی کہ جس کو پہلی وحی ماں کی پاک دامنی اور خدا کی توحید ثابت کرنے کے لیے کی گئی۔ اور انھوں نے یہ پیغام بھی دیا کہ میں اپنی والدہ کی عفت و پاکیزگی کا پہرے دار ہوں۔ اور جس طرح میری پیدائش ہر قسم کی آلودگی سے پاک اور بابرکت ہے، اسی طرح میری ماں کی عفت بھی ہمیشہ کے لیے محفوظ ہے اور میں اپنی پوری زندگی اس کی حفاظت کروں گا۔ ایسا نہ کر پایا تو میں سرکش اور بدبخت قرار پاؤں گا۔

سیدہ مریم کی ذات کی یہ عظمت قرآن کا خاص امتیاز ہے۔ اور اتنی فضیلت قرآن مجید میں دنیا کی کسی خاتون کی بیان نہیں کی۔ یہ واقعہ اس بات کی طرف لطیف اشارہ ہے کہ اس واقعے میں خدا نے بچے کی پیدائش کے لیے باپ کی ضرورت کو اضافی بنا دیا لیکن عورت کو یہ اعزاز بخشا کی وہ اس کے تخلیقی معجزے کا وسیلہ بنے۔ یوں مرد پر عورت کی فضیلت کا یہ واقعہ بڑا معنی خیز ہے۔

سیدہ مریمؑ کی زندگی کا اختتام — ایک مشترک خاموشی

یہ ایک غیر معمولی حقیقت ہے کہ قرآن مجید حضرت مریمؑ کی وفات کا کوئی ذکر نہیں کرتا اور چاروں اناجیل اور دوسرے مذہبی ماخذ بھی ان کی وفات پر خاموش ہیں۔

کچھ مفسرین عموماً یہ کہتے ہیں کہ حضرت مریمؑ نے طبعی وفات پائی لیکن نہ وقت معلوم، نہ مقام، نہ قبر۔

حضرت مریمؑ کی زندگی قرآن اور بائیبل میں منتخب، محفوظ اور بامعنی انداز میں بیان ہوئی ہے، مگر ان کی وفات کے باب میں دونوں الہامی کتابیں خاموش ہیں۔ یہ خاموشی تاریخ کی کمی نہیں، بلکہ ایک واضح اشارہ ہے کہ سیدہ کی بعد کی زندگی نے ان کی عظمت کو کوئی نقصان نہیں پہنچایا۔ وہ اسی مقام اور بے پناہ فضیلت کی حامل ہیں جس کی گواہی بائیبل اور قرآن دونوں سے ملتی ہے۔

نقطہ نظر

محمد حسن الیاس

عورت کی تادیب کا مخاطب: شوہر یا معاشرہ؟

سورہ النساء میں خواتین کو تادیب کرنے کا مخاطب شوہر ہے یا سوسائیٹی یا حکمران؟
یہ ایک علمی بحث ہے۔ اس مضمون میں یہ موقف اختیار کیا گیا ہے کہ اس کا
مخاطب شوہر ہے۔ اہل علم اس حوالے سے اپنی رائے بیان کر سکتے ہیں۔"
صالحات" کے صفحات اس علمی تبادلہ خیال کے لیے حاضر ہیں۔

قرآن مجید کے طرزِ خطاب کا بنیادی اصول یہ ہے کہ اگرچہ اس کا خطاب پیغمبر کی زبانی پوری سوسائٹی سے ہوتا ہے، لیکن عملی ہدایات ہمیشہ ان کرداروں سے متعلق ہوتی ہیں جو سیاقِ کلام میں واضح طور پر زیرِ بحث ہوں۔ عمومی خطاب حکم کے عموم کی دلیل نہیں بنتا؛ اصل ذمہ داری کا تعین ہمیشہ ہدایات کی نوعیت اور ان کرداروں سے ہوتا ہے جنہیں سیاق وسباق نمایاں کر دیتے ہیں۔

یہی حقیقت قرآن کی متعدد آیات میں دیکھی جا سکتی ہے۔ یتیموں کے بارے میں فرمایا:

اگر تمہیں خوف ہو کہ یتیموں کے درمیان انصاف قائم نہ رہے۔

یہاں خطاب عام ہے، مگر حکم صرف ان لوگوں کے لیے ہے جو یتیموں کے سرپرست ہیں۔

اسی طرح رضاعت کے احکام میں بھی خطاب اجتماعی ہے، لیکن ذمہ داری صرف ماں اور باپ پر عائد کی گئی ہے۔ پوری سوسائٹی نہ بچوں کو دودھ پلا سکتی ہے اور نہ ان کا نان نفقہ اٹھا سکتی ہے۔

یہ قرآن کے طرزِ بیان کی بنیادی حقیقت ہے کہ خطاب اگرچہ عام ہو، مگر حکم ہمیشہ اس کردار کے مطابق خاص رہتا ہے جسے سیاق نے نمایاں کیا ہو۔

اسی نوعیت کا خطاب سورۂ نساء کی آیت 34 میں بھی ہے۔ ارشاد ہوا ہے:

﴿الرِّجَالُ قَوَّامُونَ عَلَى النِّسَاءِ بِمَا فَضَّلَ اللّٰهُ بَعْضَهُمْ عَلَى بَعْضٍ وَبِمَا أَنْفَقُوا مِنْ أَمْوَالِهِمْ ۚ فَالصَّالِحَاتُ قَانِتَاتٌ حَافِظَاتٌ لِلْغَيْبِ بِمَا حَفِظَ اللّٰهُ ۚ وَاللَّاتِي تَخَافُونَ نُشُوزَهُنَّ فَعِظُوهُنَّ وَاهْجُرُوهُنَّ فِي الْمَضَاجِعِ وَاضْرِبُوهُنَّ ۖ فَإِنْ أَطَعْنَكُمْ فَلَا تَبْغُوا عَلَيْهِنَّ سَبِيلًا ۗ إِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلِيًّا كَبِيرًا﴾

مرد عورتوں کے نگران ہیں، اس لیے کہ اللہ نے ان میں سے ایک کو دوسرے پر فضیلت دی ہے اور اس لیے کہ انہوں نے اپنے مال خرچ کیے ہیں۔ سو نیک عورتیں فرماں بردار ہوتی ہیں، رازوں کی حفاظت کرتی ہیں، اس بنا پر کہ اللہ نے بھی حفاظت کی ہے۔ اور جن عورتوں سے تمھیں سرکشی کا اندیشہ ہو، انہیں نصیحت کرو، پھر ان کے بستروں میں انہیں تنہا چھوڑ دو، پھر انہیں سزا دو۔ پھر اگر وہ تمہاری بات مان لیں تو ان پر کوئی راستہ تلاش نہ کرو۔ بے شک اللہ بہت بلند، بہت بڑا ہے۔

یہاں بھی خطاب بظاہر عام ہے، لیکن سیاقِ کلام مکمل طور پر میاں اور بیوی کے باہمی تعلق، ان کی ذمہ داریوں اور ان کے داخلی نظم پر قائم ہے۔ قوامیت کا ذکر، عورتوں کی ذمہ داریوں کی تعیین، غیب میں ان کی حفاظت، پھر ان ذمہ داریوں میں کوتاہی کی صورت میں اصلاح کے تین مراحل، یہ سب اس بات کی قطعی شہادت ہیں کہ یہاں اصل مخاطب شوہر اور بیوی ہی ہیں، نہ کہ سوسائٹی کے تمام طبقات۔

یہاں کوئی یہ کہہ سکتا ہے کہ چونکہ خطاب میں جمع کا صیغہ ہے، اس لیے تادیبی مراحل میں مخاطب شوہر کے ساتھ سوسائٹی بھی ہو سکتی ہے۔ الفاظ یہ ہیں:

﴿وَاللَّاتِي تَخَافُونَ نُشُوزَهُنَّ فَعِظُوهُنَّ وَاهْجُرُوهُنَّ فِي الْمَضَاجِعِ وَاضْرِبُوهُنَّ﴾

ہمارے نزدیک یہ رائے سیاق و سباق کے بالکل خلاف ہے، کیونکہ آیت کی ابتدا سے آخر تک پورا بیان شوہر ہی کے کردار اور اس کی ذمہ داری پر قائم ہے۔

اسی مقام پر قرآن نے خود اس تادیب کو نافذ کرنے والے فریق کو براہِ راست مخاطب کر کے یہ فیصلہ بھی کر دیا ہے کہ ان ہدایات کا اصل مخاطب کون ہے۔ ارشاد ہوا ہے:

﴿فَإِنْ أَطَعْنَكُمْ فَلَا تَبْغُوا عَلَيْهِنَّ سَبِيلًا﴾

پھر اگر وہ تمہاری بات مان لیں تو ان پر کوئی راستہ تلاش نہ کرو۔

یہاں ”کم“ کی ضمیر شوہر کے سوا کسی پر نہیں جاتی، کیونکہ اطاعت ہمیشہ اسی فریق سے متعلق ہوتی ہے جس کے ساتھ ازدواجی معاہدہ قائم ہو۔ بیوی کی اطاعت شوہر سے متعلق ہے، سوسائٹی سے نہیں۔ سوسائٹی نہ قوام ہے اور نہ اس کے ساتھ اطاعت یا نافرمانی کا کوئی مفہوم قائم ہوتا ہے۔

چنانچہ شوہر اور سوسائٹی دونوں کو بیک وقت مخاطب قرار دینا عملی حقیقت اور سیاق وسباق کے مکمل خلاف ہے۔ آیت کی یہ ضمیر پوری قطعیت کے ساتھ بتا دیتی ہے کہ اس ہدایت کا مخاطب صرف اور صرف شوہر ہیں۔

اس مقام پر اس بات کی بھی خاص طور پر وضاحت ضروری ہے کہ ان تین اصلاحی مراحل میں سے دوسرا مرحلہ، یعنی

”وَاهْجُرُوهُنَّ فِي الْمَضَاجِعِ“

کسی بھی پہلو سے سوسائٹی سے متعلق ہدایت ہو ہی نہیں سکتا۔

اس لیے کہ مَضَاجِع سے مراد لیٹنے کی جگہیں ہیں، یعنی بستر اور خواب گاہیں، اور یہ وہ دائرہ ہے جو فطری، عرفی اور عملی ہر اعتبار سے صرف اور صرف شوہر اور بیوی کے باہمی تعلق سے متعلق ہوتا ہے۔ معاشرہ نہ کسی کے بستر میں شریک ہوتا ہے، نہ اسے یہ اختیار حاصل ہے کہ وہ میاں بیوی کے نجی رہائشی نظم میں مداخلت کرے۔

بستر ترک کرنے کی ہدایت صرف اسی فریق سے متعلق ہو سکتی ہے جس کے ساتھ عورت کا ازدواجی تعلق قائم ہے، جس کے گھر میں وہ رہتی ہے اور جس کے ساتھ اس کی ازدواجی زندگی بسر ہوتی ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ یہ تعبیر دراصل جنسی تعلق کے ترک کرنے کا ایک استعارہ ہے، جسے قرآن نے اس کی ظاہری اور محسوس صورت میں بیان کر دیا ہے، اور یہ قرآن مجید کا معروف ادبی اسلوب ہے کہ وہ نہایت نازک اور نجی نوعیت کی باتوں کو براہِ راست کے بجائے ایسے ہی باوقار اور اشاراتی پیرائے میں بیان کرتا ہے۔

چنانچہ ”فِي الْمَضَاجِعِ“ کی قید خود اس بات کی قطعی دلیل ہے کہ یہاں مخاطب سوسائٹی نہیں بلکہ صرف شوہر ہے، اور اس ہدایت کو کسی اجتماعی یا سماجی تناظر میں منتقل کرنا نہ صرف سیاق کے خلاف ہے بلکہ عملی حقیقت سے بھی کوئی مناسبت نہیں رکھتا۔

البتہ قرآن نے سوسائٹی کو ازدواجی معاملات میں ایک خاص مقام پر ضرور شامل کیا ہے، اور وہ اس وقت ہے جب مسئلہ نشوز کے داخلی دائرے سے نکل کر شقاق کے سماجی بحران میں بدل جائے۔ فرمایا:

﴿وَإِنْ خِفْتُمْ شِقَاقَ بَيْنِهِمَا﴾

اور اگر تمہیں دونوں کے درمیان اختلاف کا اندیشہ ہو...

یہاں "تم" سے مراد خاندان کے بڑے یا وہ اجتماعی ذمہ دار لوگ ہیں جنہیں اس بگاڑ کے وسیع اثرات کا سامنا کرنا پڑ سکتا ہے، اور میاں بیوی کو "بَيْنِهِمَا" کہہ کر دونوں کو الگ کر دیا ہے۔

چنانچہ شقاق وہ مرحلہ ہے جہاں گھر کے اندر اصلاح کے تمام راستے بند ہو جاتے ہیں، معاملہ ٹوٹ پھوٹ یا ظلم کے خطرے میں تبدیل ہو جاتا ہے اور اس کے اثرات خاندان اور پھر پورے معاشرے تک پھیلنے لگتے ہیں۔ اس موقع پر قرآن نے حکمین مقرر کرنے کی ہدایت دے کر سوسائٹی کو شامل کیا ہے، کیونکہ یہاں مسئلہ داخلی نہیں رہتا بلکہ باقاعدہ سماجی نوعیت اختیار کر لیتا ہے۔

یوں قرآن نے نشوز اور شقاق کے دونوں مراحل کو پوری وضاحت کے ساتھ الگ رکھا ہے۔ نشوز صرف ازدواجی اور داخلی معاملہ ہے، اس لیے آیت 34 کا مخاطب صرف شوہر ہے۔ شقاق سماجی مسئلہ ہے، اس لیے آیت 35 میں سوسائٹی کو مخاطب کیا گیا ہے۔

آیت 34 میں ﴿فَإِنْ أَطَعْنَكُمْ﴾ اور آیت 35 میں ﴿وَإِنْ خِفْتُمْ﴾ دونوں اپنے اپنے مرحلے کے دائرۂ اختیار اور اصل مخاطب کو فیصلہ کن طور پر متعین کر دیتے ہیں۔

اس پورے اسلوب کو ایک سادہ دنیاوی مثال سے بھی سمجھا جا سکتا ہے۔ فرض کیجیے ایک حکمران اپنی قوم سے عمومی خطاب کرتے ہوئے کہتا ہے کہ ہم نے تمہارے محکموں پر افسر مقرر کیے ہیں، اس بنا پر کہ ذمہ داریاں اور وسائل ان کے سپرد کیے گئے ہیں۔ پس جو ماتحت درست رویہ اختیار کریں، وہ ان کی ہدایات پر کاربند رہیں گے، اور جن کے بارے میں تمہیں اندیشہ ہو کہ وہ ہدایات سے ہٹ رہے ہیں، تو پہلے انہیں سمجھاؤ، پھر ضرورت ہو تو ان کے اختیارات میں کمی کرو، اور اگر اس پر بھی درست نہ ہوں تو ان کے خلاف تادیبی اقدام کرو۔ پھر اگر وہ تمہاری بات مان لیں تو ان پر کوئی زیادتی کا راستہ نہ ڈھونڈو۔ یہاں خطاب پوری قوم سے ہے، لیکن عملی ہدایات صرف افسر کے لیے ہیں، کیونکہ مذکورہ تمام اقدامات اسی کے دائرہ اختیار میں آتے ہیں۔

لیکن اگر یہی حکمران آگے کہے کہ اگر تمہیں خوف ہو کہ افسر اور ماتحت کے درمیان اختلاف اس حد تک بڑھ گیا ہے کہ داخلی اصلاح ممکن نہیں رہی اور اس کا اثر پورے محکمے تک پہنچنے لگا ہے، تو تم لوگ اس نزاع کو دیکھنے کے لیے دونوں کی طرف سے غیر جانب دار حکم مقرر کرو۔ اگر وہ اصلاح چاہتے ہوں گے تو ہم ان کے درمیان موافقت پیدا کر دیں

گے۔ اس مقام پر خطاب کا رخ بدل جاتا ہے اور مخاطب اب افسر نہیں بلکہ وہ اجتماعی ذمہ دار ہیں جن پر محکمے کے عمومی نظم کی حفاظت کی ذمہ داری ہے، کیونکہ اس درجے پر جھگڑا ادارے کے لیے خطرہ بن جاتا ہے۔ اس مثال میں دو مرحلے بالکل نمایاں ہیں۔ پہلا مرحلہ خالص افسر اور ماتحت کے باہمی نظم سے متعلق ہے اور تمام اقدامات اسی کردار کے سپرد ہیں۔ دوسرا مرحلہ وہ ہے جہاں اختلاف اس حد تک بڑھ جاتا ہے کہ محکمے کا نظم متاثر ہونے لگتا ہے اور یوں معاملہ اوپر کی اتھارٹی کے دائرے میں داخل ہو جاتا ہے۔ یہی ترتیب قرآن نے نشوز اور شقاق کے دونوں مراحل میں قائم کی ہے۔ نشوز داخلی مسئلہ ہے جس کا مخاطب صرف شوہر ہے، اور شقاق سماجی مسئلہ ہے جس میں سوسائٹی کے ذمہ داروں کو مخاطب کیا گیا ہے۔

کوکب شہزاد

کرسمس کی مبارک باد اور ہمارا رویہ

مسلمان معاشروں میں غیر مسلموں سے عمومی طور پر فاصلہ رکھا جاتا ہے۔ ان کی ہر قسم کی تقریبات میں شرکت کو اسلامی شریعت کے خلاف سمجھا جاتا ہے۔ حالانکہ دین کا تقاضا تو صرف یہی ہے مسلمانوں ان تقریبات کے خلافِ شریعت کاموں میں شریک نہ ہوں۔ لیکن اس کے تہواروں اور دوسری سماجی تقریبات جن میں اس طرح کی کوئی قباحت نہ ہو، شرکت کی کوئی ممانعت نہیں ہے۔ بلکہ سماجی تعلقات کو بحال رکھنا ضروری ہے۔ کرسمس کا معاملہ بھی ایسا ہی ہے۔

جب ہم لوگوں سے ملتے ہیں تو ہمیں ان کی طرف عجیب و غریب سوالوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔

سوال وجواب کی ایک نشست میں ایک خاتون نے مجھ سے پوچھا کہ ہمیں کرسمس کے موقع پر مسیحیوں کو حضرت عیسیٰ کی پیدایش پر مبارک باد نہیں دینی چاہیے؟

میں نے جواب دینے کے بجائے انھی سے پوچھا کہ ہمیں حضرت عیسیٰ کی پیدایش پر مسیحیوں کو کیوں مبارک نہیں دینی چاہیے؟ وہ بھی تو ہمارے نبی تھے اور اللہ تعالی نے ہمارے لیے ہر نبی پر ایمان لانا لازمی قرار دیا ہے۔ ان پر ایمان لائے بغیر ہم مسلمان نہیں بن سکتے۔

اس خاتون نے کہا کہ مسیحیوں کا ایک گروہ انھیں خدا کا بیٹا کہتا ہے بلکہ بعض تو انہیں خدا ہی مانتے ہیں۔ میں نے اس خاتون سے کہا کہ اس قسم کی باتیں تو ہر مذہب کے پیروکار کرتے ہیں۔ عرب کے یہودی بھی حضرت عزیر کو خدا کا بیٹا

کہتے تھے کیونکہ جب تورات کھو گئی تو حضرت عزیر نے اپنی یادداشت سے تورات کو دوبارہ لکھا تھا۔ اس وجہ سے یہودی انھیں خدا کا بیٹا کہنے لگے۔ لیکن اس وجہ سے پیغمبروں کا مقام و مرتبہ تو کم نہیں ہو جاتا اور نہ ہی انھوں نے خود کبھی اپنی قوم کے لوگوں سے ان باتوں کا تقاضا کیا ہے کہ انھیں خدا کا شریک مانا جائے بلکہ اس کے برعکس وہ اپنی پوری زندگی توحید کی تعلیم دیتے رہے ہیں۔

اسی طرح میں نے اپنی ایک کلاس میں حضرت عیسٰی کے حوالے سے کہا کہ انھوں نے فرمایا تھا کہ نبی آخر الزماں محمد صلّی علیہ وسلّم کی تصدیق کرنا اور ان کنواری دلہنوں کی طرح نہ ہو جانا جو ہاتھوں میں دیا لیے ساری رات اپنے دلہے کا انتظار کرتی ہیں اور جب دلہے کے آنے کا وقت ہوتا ہے تو وہ سو جاتی ہیں۔ میری یہ بات سن کر ایک خاتون کہنے لگیں:

آپ ہمیں صرف قرآن کی باتیں بتایا کریں کسی اور نبی کی باتیں نہ بتایا کریں۔

میں نے واضح کیا کہ اس مثال میں جس شخص کی بات کی گئی ہے اس سے مراد نبی خاتم الزماں محمّد صلّی اللہ علیہ وسلّم ہیں ۔جب آپ کی تعلیمات سے پورا ماحول روشن ہو گیا تو ان یہودیوں نے جانتے بوجھتے کہ آپ اللہ کے سچے نبی ہیں، آپ کا انکار کر دیا۔

وہ کہتے تھے کہ امیّوں کے بارے میں ہماری کوئی ذمّہ داری نہیں اور نہ ہی ان کے نبی کو ماننا ہمارے لیے ضروری ہے۔ ان کی ان باتوں سے اللہ تعالی سخت ناراض ہوئے نبیوں کے معاملے میں تعصب کا شکار ہونے سے ہم دین کے معاملے میں اس خیر کو نہیں پاسکتے جو اللہ تعالی ہمیں دینا چاہتے ہیں۔ اور سورۃ البقرہ میں مسلمانوں کو ہدایت دیتے ہوئے فرمایا:

كُلٌّ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَ مَلٰٓئِكَتِهٖ وَ كُتُبِهٖ وَ رُسُلِهٖ لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْ رُّسُلِهٖ وَ قَالُوْا سَمِعْنَا وَ اَطَعْنَا ۫ غُفْرَانَكَ رَبَّنَا وَ اِلَيْكَ الْمَصِيْرُ

ترجمہ: یہ سب اللہ پر ایمان لائے، اور اُس کے فرشتوں اور اُس کی کتابوں اور اُس کے پیغمبروں پر ایمان لائے۔ (اِن کا اقرار ہے کہ) ہم اللہ کے پیغمبروں میں سے کسی کے درمیان کوئی فرق نہیں کرتے۔

یہ نبیوں کی ایک لڑی ہے جسے اللہ تعالی نے ہر بستی ہر قریہ میں یکے بعد دیگرے بھیجا۔ یہ اللہ تعالی کا وہ وعدہ تھا جسے اللہ تعالی نے حضرت آدم علیہ السلام سے اس وقت لیا تھا جب اللہ تعالی نے حضرت آدم کو تخلیق کیا اور انھیں زمین پر اتارتے ہوئے فرمایا تھا کہ میں تمھاری اولاد کی ہدایت کے لیے میں ہر بستی اور نگر میں ان کے اندر سے ہی نبی اور رسول بھیجوں گا۔ جو ان کے تمام سوالوں کا جواب دیں گے اور آخری دم تک ان کو صحیح راستے پر چلانے کی کوشش کریں گے۔

فَاِمَّا یَاْتِیَنَّكُمْ مِّنِّیْ ہُدًی فَمَنْ تَبِعَ ہُدَایَ فَلَا خَوْفٌ عَلَیْہِمْ وَ لَا ہُمْ یَحْزَنُوْنَ ﴿۳۸﴾ وَ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا وَ كَذَّبُوْا بِاٰیٰتِنَاۤ اُولٰٓىٕكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ہُمْ فِیْہَا خٰلِدُوْنَ ﴿۳۹﴾

پھر میری طرف سے اگر کوئی ہدایت تمھارے پاس آئے تو اُسی پر چلنا، اِس لیے کہ جو لوگ میری اِس ہدایت کی پیروی کریں گے، اُن کا صلہ جنت ہے، سو اُن کے لیے نہ وہاں کوئی اندیشہ ہے اور نہ وہ کبھی غم زدہ ہوں گے۔

اللہ تعالی نے جس مقصد کے لیے نبیوں اور رسولوں کو بھیجا اس مقصد کو اگر سمجھ لیا جائے تو کوئی بھی ان نبیوں میں فرق نہیں کرے گا چاہے وہ یہود و نصاری ہوں یا پھر مسلمان۔

حضرت عیسٰی علیہ السلام کے بارے میں عیسائیوں کا ایک گروہ جو خلاف حقیقت باتیں کرتے ہیں انھیں اللہ تعالی نے سورۃ النساء میں بالکل واضح کر دیا ہے۔ وہ حضرت عیسٰی کے بارے میں کہتے ہیں کہ وہ اللہ تعالی کے بیٹے ہیں اور کچھ کہتے ہیں کہ وہ خدا کے وجود کا حصّہ ہیں اور بعض نے تو یہاں تک جرات کر ڈالی کہ وہ کہتے ہیں کہ وہ عین خدا ہیں لیکن اس میں حضرت عیسٰی کا اپنا تو کوئی قصور نہیں۔ یہ بالکل ایسے ہے کہ ہم مسلمان اپنے نبی صلّی علیہ وسلّم کی طرف بہت سی خلاف حقیقت باتیں منسوب کرتے ہیں جو آپ صلّی علیہ وسلّم نے کبھی نہیں فرمائی تھیں۔ اللہ تعالی نے ان تمام نظریات کی نفی سورۃ النساء میں کی ہے۔

ترجمہ: "اے اہل کتاب، اپنے دین میں غلو نہ کرو اور اللہ کے حق میں حق کے سوا کوئی بات نہ کہو۔ حقیقت یہ ہے کہ مسیح عیسیٰ ابن مریم اللہ کا ایک رسول اور اُس کا ایک قول ہی تھا جو اُس نے مریم کی طرف القا فرمایا تھا اور اُس کی جانب سے ایک روح تھا (جو اللہ نے اُس میں پھونک دی تھی)۔ سو اللہ اور اُس کے رسولوں پر ایمان لاؤ اور (اللہ کو) تین نہ بناؤ۔ باز آجاؤ، یہی تمھارے حق میں بہتر ہے۔ اللہ ہی تنہا معبود ہے، وہ اِس سے پاک ہے کہ اُس کے اولاد ہو۔ زمین اور آسمانوں میں جو کچھ ہے، اُسی کا ہے اور اُن کے معاملات کو دیکھنے کے لیے اللہ ہی کافی ہے۔ مسیح کو ہرگز اِس بات سے کوئی عار نہ ہو گی کہ وہ اللہ کا ایک بندہ ہو اور نہ اللہ کے مقرب فرشتے اِسے کبھی عار سمجھیں گے۔ اگر کوئی اللہ کی بندگی کو اپنے لیے عار سمجھتا اور تکبر کرتا ہے تو عنقریب وہ سب کو گھیر کر اپنے حضور میں اکٹھا کر لے گا۔ پھر جو ایمان لائے اور جنھوں نے اچھے عمل کیے ہیں، اُنھیں وہ اُن کا پورا اجر دے گا اور اپنے فضل سے اُن کو زیادہ بھی عطا فرمائے گا۔ اور جن لوگوں نے اُس کی بندگی کو عار سمجھا اور تکبر کیا ہے، اُنھیں وہ دردناک سزا دے گا اور اللہ کے مقابل میں وہ اپنے لیے کوئی حمایتی اور کوئی مددگار نہ پائیں گے۔ (النساء 171-173)

اس لیے حضرت عیسیٰ کا اللہ تعالی کے نزدیک بہت اونچا مقام ہے اور انھوں نے اپنے پیروکاروں کو کبھی نھیں کہا تھا کہ انھیں اللہ تعالی کا شریک بنایا جائے اس لیے اللہ تعالی کے نبی ہونے کی حیثیت سے ان کی پیدائش پر خوشی منانا اور ان کے پیروکاروں کو مبارک باد دینے میں کوئی مضائقہ نہیں ہے۔

اب آتے ہیں اس بات کی ہمیں قرآن مجید کے ہوتے ہوئے دوسری آسمانی کتابوں کو نہیں پڑھنا چاہیے تو یہ بالکل غلط بات ہے۔ ہمیں جس طرح تمام نبیوں کو ماننا چاہیے اسی طرح تمام آسمانی کتابوں پر بھی ایمان لانا ضروری ہے۔ ان کتابوں پر ایمان لانا ہمارے ایمان کا حصّہ ہے۔ ان کی اہمیت اور بھی زیادہ اس وقت بڑھ جاتی ہے جب ہم ان کتابوں میں نبی صلّی علیہ وسلّم کے آنے کی پیش گوئیاں پڑھتے ہیں۔ ان کے کتابوں میں آپ کے بارے میں جو ذکر آیا ہے اس سے آپ کی حیثیت روز روشن کی طرح عیاں ہو جاتی ہے اور قرآن مجید اہل کتاب کو بار بار توجّہ دلاتا ہے کہ تم اس نبی صلّی علیہ وسلّم کا کیسے انکار کر سکتے ہو جب کے ان کا ذکر تم اپنی کتابوں میں پڑھتے ہو اور تم ان کو ایسے پہچانتے ہو جس طرح انسان اپنی اولاد کو پہچانتا ہے۔ (سورۃ الصف آیت 6)

اس ساری بحث کا مقصد یہ ہے کہ ہمیں اللہ تعالی کے بنائے ہوئے قاعدے اور قانون کے مطابق دین کی پیروی کرنی چاہیے۔ دین کو اپنے جذبات کی نذر نہیں کرنا چاہیے ورنہ ہم دین کے معاملے میں بہت سی خیر و برکت سے محروم ہو جائیں گے۔

نقطہ نظر

فابیہ احسان

طلاق کی حقیقت—جواز یا ممانعت

طلاق کے حوالے سے فابیہ احسان نے قارئین کے ذہن میں پیدا ہونے والے کئی نازک اور چبھتے ہوئے سوالوں کا جواب بڑے احسن طریقے سے دیا ہے۔ نقطہ نظر کے اس سلسلہ مضامین میں قارئین کے افکار و رائے سے ادارے کا متفق ہونا ضروری نہیں۔

ارادہ و اختیار کی آزادی ہی وہ اصل ہے جس پر انسان کو مخلوقات میں شرف و امتیاز حاصل ہے۔ دنیا میں انسان کا امتحان دراصل اِسی آزادی کے اچھے برے استعمال کا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انسانی معاشرت کے ہر معاملے اور تعلق میں اختیار کی آزادی کے سوئے استعمال سے برائی کا ظہور بھی ہوتا ہے۔

اس لیے خاندان، معیشت، سیاست، سماج غرض انسانی تمدن کے ہر دائرے میں اللہ کا دین افراد پر چند اصول اور ضابطوں کی لگام ڈالتا ہے۔ انسان چونکہ اپنے سارے کام عقلی توجیہ اور اخلاقی فتوے کی روشنی میں کرتا ہے اس لیے اللہ کے دین میں مقرر کردہ یہ اصول و ضوابط بھی اپنی ذات میں عقلی اور اخلاقی دونوں توجیہات رکھتے ہیں جن کو انسان بحسن و خوبی سمجھ سکتا ہے بشرطیکہ وہ تعصب اور مفاد پرستی سے بالاتر ہو کر غور کرے۔

خاندان کا ادارہ

انسانی معاشرت کا بنیادی یونٹ خاندان کا ادارہ ہے جو زوجین کے تعلق سے وجود میں آتا ہے۔ بنیاد غیر معمولی اہمیت رکھتی ہے کیونکہ پوری عمارت اِس پر ٹِکی ہوتی ہے۔ انسانی زندگی کا آغاز بھی کمزور و ناتواں بچے کی صورت میں ہوتا ہے

جسے معاشرے میں اپنے پاوں پر کھڑا ہونے میں کئ سال لگ جاتے ہیں، اور عمر کے آخری سال بھی بڑھاپے کے ضعف میں گزرتے ہین، گویا جوانی کے چند سال چھوڑ کر باقی ساری عمر انسان محتاج محض ہوتا ہے۔ اللہ تعالٰی نے نکاح کا ادارہ بنا کر انسان کو پوری زندگی کے لیے ایسا ماحول فراہم کیا ہے جہاں وہ پیدائش سے موت تک کا سفر ایک محفوظ پناہ گاہ میں مکمل کرتا ہے۔

نکاح ایک معاہدہ

دو لوگ مل کر کاروباری یا فلاحی کوئی سا بھی ادارہ شروع کرنے کے لیے کچھ شرائط پر ایک معاہدہ کرتے ہیں ادارے کا سربراہ متعین کرتے ہیں, جس طرح معاہدے میں چلنے کے لیے شرائط ہوتی ہیں اسی طرح معاہدے سے نکلنے یا اسے ختم کرنے کے بھی ضابطے ہوتے ہیں۔

نکاح بھی عورت و مرد کے مابین زندگی بھر کی رفاقت کا معاہدہ ہے۔ انسانی نسل کی بقا کے لیے یہ ادارہ نکاح چونکہ اللہ نے بنایا ہے لہذا معاہدہ نکاح کی شرائط اور سربراہ ادارہ کو اللہ نے خود مقرر کر دیا۔ دنیاوی معاہدوں کی نیچر کے عین مطابق معاہدہ نکاح کو ختم کرنے کے بھی اصول وضوابط بھی مقرر کر دیئے۔

مفتی شفیع عثمانی رح کا کہنا ہے کہ خدا نے نکاح و طلاق کے معاہدات کو عام معاہدوں کے جیسا نہیں رکھا بلکہ ان میں خصوصی شرائط اور طریقہ مقرر کیا جس کی حکمت یہ ہے کہ خصوصا طلاق جیسے معاملے میں عورت و مرد کے مابین، نسلوں اور خاندانوں میں فساد برپا ہونے کا اندیشہ ہوتا ہے۔ (تفسیر معارف القرآن: البقرہ 229-230)

الہامی دین- فطرت انسانی کے عین مطابق

تاریخ انسانی بے شمار مثالوں سے بھری پڑی ہے کہ جب بھی معاملات کو سر تا سر انسانی عقل کے حوالے کیا گیا، نتیجہ انسانی فطرت کے خلاف بصورت ظلم سامنے آیا۔ مثلا ماضی قریب میں ہندوستانی عورت کی شوہر سے وفاداری کا پیمانہ "ستی پر تھا" کی رسم تھی یعنی اسے شوہر کی چِتا کے ساتھ جل کر مر جانا ہے۔ اسی لیے باپ بیٹی کو سسرال وداع کرتے وقت وصیت کرتا: "اب تمھاری میت ہی اس گھر سے نکلے گی"، ہندو مذہب میں چند دہائیوں قبل تک رشتہ زوجین سے آزادی محض موت ہی دلا سکتی تھی۔

اسی طرح قبائلی دور میں باپ کی ساری جائیداد بڑے بیٹے کو منتقل ہو جاتی کیونکہ وہ جنگ و جدال اور معاشی سرگرمی میں باپ کا ہاتھ بٹاتا، کم عمر اولاد بشمول بیٹے بیٹیاں اس بنا پر محروم کر دیئے جاتے کہ وہ مددگار نہ بن پاتے چنانچہ وہ سب

اپنی ساری زندگی بڑے بیٹے کے مرہون منت ہو کر رہ جاتے۔ برصغیر کے دیہاتوں میں تو پچھلی صدی کے اوائل تک کم عمر اولاد کو وراثت سے محروم کر دینا مروج رہا۔ عقل وحی کے تابع نہ رہے تو اسی طرح انحرافات کا شکار ہوتی ہے۔

اس کے برعکس اللہ کا دین عورت کی انفرادی حیثیت اور حقوق کو تحفظ دیتا ہے اور قانون وراثت کی صورت میں ناانصافی کو روکتا ہے۔ انبیاء علیہم السلام جو دین لے کر آئے اس میں ہمیشہ سے معاہدہ نکاح ختم کرنے کا پورا اختیار فریقین کو حاصل رہا اور ایسا طریقہ بتایا گیا جس میں فریقین باہم ظلم یا ناانصافی کیے بغیر اعلی ظرفی اور شرف انسانی کے عین مطابق الگ ہو سکتے ہیں، ہمارے ہاں دینی اصطلاح میں یہ طریقہ "طلاق" کہلاتا ہے۔

سوال یہ اٹھ جاتا ہے کہ۔۔۔۔۔۔۔۔

- وہ دین جو ایثار، عفو و درگزر کو ایک مومن کے شِعار بتاتا ہے، ایفائے عہد کو مومن کی پہچان دکھاتا ہے، صلہ رحمی کو رشتوں کی سلامتی گردانتا ہے، انسانی معاشرت کی بنیاد میں کھڑے زوجین کو کیسے یہ حق دے سکتا ہے کہ وہ ان تمام اخلاقی اقدار سے بے نیاز ہو کر الگ ہو جائیں؟
- وہ ربِّ حکیم العلیم، جو کائنات کی ہر شے میں حکمت کا دعوے دار ہے، کیسے ایسا قانون دے سکتا ہے جس کا لوگ ناجائز فائدہ اٹھا سکتے ہیں؟

ان سب کا جواب اس جملے میں مخفی ہے: "اسلام دین فطرت ہے"

خدا یہ جانتا ہے کہ تمام انسان اعلی ظرفی کا مظاہرہ کرنے والے نہیں ہوتے بلکہ ان میں تھڑدلہ پن بھی ہوتا ہے، لوگ ارادہ و اختیار کا سوئے استعمال بھی کرتے ہیں۔ لہذا پہلے مرحلے میں تو اللہ کا دین انسان کی تعلیم و تربیت اور اچھے ماحول کی فراہمی کا تقاضا کرتا ہے تاکہ انسان کا رویہ اعلی اخلاقی اقدار کے مطابق پروان چڑھے، اسکے باوصف اگر انسان سے برائی سرزد ہو تو دین تادیب و تنبیہہ کا طریقہ مقرر کرتا ہے تاکہ معاشرے میں برائیوں کے جڑ پکڑنے اور پھیلنے پر روک تھام کی جائے۔

رسول اللہ کے خطبہ حجتہ الوداع کے مطابق خدا نے انسان کی عزت، جان اور مال کو ذی الحج، شہر حرم اور کعبہ کے جیسی حرمت عطا کی ہے۔ (بخاری: 1741)

لیکن وہی انسان جب ناحق قتل کرتا ہے تو قصاص کے تحت اپنی جان کی حرمت کھو دیتا ہے، کسی شخص کا محفوظ مال چراتا ہے تو قطع ید کے تحت اپنے ہاتھ کی حرمت کھو دیتا ہے، اصول منفعت پر باپ کا وارث اگر اپنے ہی باپ کو جانی نقصان پہنچائے تو علم الفقہہ کے تحت وراثت سے محروم قرار پاتا ہے۔

اللہ تعالی نے نکاح کا ادارہ اسی خاطر بنایا جہاں نسلوں کی پرورش محفوظ ماحول میں ہو، جوانوں کو ان کی جنسی، نفسیاتی، جذباتی تسکین کا سامان میسر ہو، بزرگوں کی دیکھ بھال کا اہتمام ہو، نئی نسل دین اور فطرت میں طے شدہ اخلاقی قدریں اپنے ماحول سے سیکھ سکیں۔ لیکن وہی ماحول اگر انسان کی نفسیات و جذبات کے لیے محفوظ نہ رہے، جہاں بنیادی اخلاقیات کا جنازہ نکلے، جہاں بزرگوں کا وقار سلامت نہ رہے، جہاں رشتوں کا لحاظ و پاسداری نہ رہے، جہاں بدلے کی نفسیات ہر اخلاقی قدر کو روندتی چلی جائے، ایسا ماحول انسانی معاشرت میں تعمیری کی بجائے تخریبی کردار ادا کرتا ہے اور انسانی تہذیب کو تدریجی انداز میں علم و اخلاق کے زوال کی طرف دھکیلتا ہے۔

خالق کائنات جس کے تخلیق کردہ ذرے ذرے میں حکمت پوشیدہ ہے نا صرف بندوں سے تقاضا کرتا ہے کہ اپنے معاملات میں جذباتیت کی بجائے عقل اور سمجھ سے کام لیں بلکہ اپنے منتخب کردہ دین میں بھی بندوں کی تربیت کرتا ہے کہ ترجیح و فوقیت کی بنیاد سر تا سر عقلی ہونی چاہیئے اور یہ تو روز روشن کی طرح عیاں ہے کہ عقل وحی الہی کے تابع ہو تو ہمیشہ ٹھیک ترجیح قائم کرتی ہے۔

ٹکراؤ میں معیار ترجیح

اللہ تعالی نے جہاں یہ تلقین کی ہے کہ انسان خدا کے ساتھ اپنے والدین کا بھی شکر گزار بن کر رہے، ان سے حسن سلوک سے پیش آئے وہیں یہ بھی توجہ دلائی کہ والدین کی اطاعت گزاری وہاں نہ کی جائے جہاں بندہ خدا کی نافرمانی کا مرتکب ہو رہا ہو۔(لقمان:14-15)"لا طاعة لمخلوق في معصية الخالق"

خالق کی معصیت میں مخلوق کی اطاعت جائز نہیں"(سنن ترمذی:1707)

روز مرہ زندگی میں اکثر دو اخلاقی قدروں میں ٹکراؤ ہو جاتا ہے، ایسے میں فیصلہ اس بنیاد پر ہوتا ہے کہ ہمارے دین نے کس کو فوقیت دی ہے۔ مثلا اگر کسی معصوم کی جان کو جھوٹ بول کر حملہ آوروں سے بچانے اور سچ بول کر اسکی جان خطرے میں ڈال دینے کے مابین انتخاب کرنا پڑے تو ہم انسانی جان بچانے کو سچ بولنے پر ترجیح دیں گے۔

رشتہ نکاح اور قانون طلاق چونکہ دونوں اللہ تعالیٰ ہی کے پیش کردہ ہیں لہٰذا میرے نزدیک کچھ ایسا ہی معاملہ ان کے مابین ہے۔ وہ تعلق جس میں شوہر بیوی کے مابین حفظ مراتب کا لحاظ نہ رہے۔ بچوں کی مثبت بنیاد پر نفسیاتی و جذباتی نشوونما کے لیے محفوظ ماحول میسر نہ رہے۔ مقابلہ بازی میں اپنے ظرف کو کسی بھی حد تک گرا لیا جائے۔ رازوں کے امین ہی انہیں افشا کر کے رشتوں کے وقار کو مجروح کرتے پھریں۔ بدلے کی نفسیات، مخاصمانہ رویے اور خاندانی نفاق پروان چڑھیں۔

ایسے تعلق پر انسانی وقار، مثبت ماحول، انسانیت کی بقا اور معاشرے کی سلامتی کی ضامن اعلی اخلاقی اقدار کو ترجیح دیتے ہوئے خدا نے معاہدہ نکاح میں بندھے دو افراد ہی سے یہ مطالبہ کیا ہے کہ چونکہ وہ دونوں اپنی جگہ اعلی ظرفی، رعایت اور خیر خواہانہ رویہ دکھانے کو تیار نہیں لہذا سب کی بہتری اسی میں ہے کہ یہی دو لوگ معاہدہ ختم کر کے کنارہ کشی اختیار کریں۔

مروج معاشرتی افکار کا جائزہ

1۔ ہمارے ہاں ایک روایت کی بنیاد پر یہ تاثر پھیلا کہ طلاق دینے والا مرد یا اسکا مطالبہ کرنے والی عورت خدا کے ناپسندیدہ ہیں اور وہ ان پر غضب ناک ہوتا ہے۔

"اللہ کے نزدیک حلال چیزوں میں سب سے ناپسندیدہ چیز طلاق ہے" (حدیث:2178)

اسی تاثر کی بنا پر عزیز و اقارب بھی ایسے مرد و عورت سے ناراضی اور ملامت کا رویہ اپناتے ہیں۔

در حقیقت یہ حدیث اس بات پر زور دیتی ہے کہ نکاح کے رشتے کو بچانے کی ہر ممکن کوشش کی جائے، اور طلاق کو آخری حل کے طور پر دیکھا جائے، نہ کہ معمولی جھگڑوں میں فوراً اس پر عمل کیا جائے. اس کا یہ بھی مطلب ہر گز نہیں کہ جھگڑوں کو معمولات زندگی بنالیا جائے۔

اللہ تعالیٰ نے سرکشی کی اصلاح اور گھر بچانے کے لیے ترتیب و تدریج کے ساتھ چار اقدام لینے کا حکم دیا۔

وعظ و نصیحت

بے تکلف گھلنے ملنے پر روک لگانا

شوہر کا بیوی کو جسمانی سزا دینا (جس طرح والدین اولاد کو اور استاد شاگرد کو دیتے)

فریقین کی جانب سے ایک ایک حکم کا بیٹھنا اور مصالحت کی کوشش کرنا

پہلے تین اقدام مرد خود اپنی چار دیواری کے اندر لوگوں کے علم میں لائے بغیر اپنی بیوی کی اصلاح و تربیت کے لیے اٹھائے، لیکن اگر یہ کوشش بے سود جائے تب چوتھا و آخری قدم اٹھائے اور خاندان قبیلے کے بزرگ سربراہان مصالحت کے لیے اپنا کردار ادا کریں۔ ان چاروں اقدام کے بعد آخری حل کے طور پر طلاق کی طرف جائیں۔ (النساء:34) (الطلاق:2)

2۔ دور حاضر میں بعض لڑکیاں سوشل میڈیا اور جدید تہذیب کے زیر اثر خاص اسٹیٹس اور لائف اسٹائل کی شادی

شدہ زندگی چاہتی ہیں، اسی طرح کچھ لڑکیاں جدید تعلیمی رجحان کے باعث مخصوص پیشہ ورانہ مثلاً ڈاکٹری، ٹیچنگ جیسی خدمات سرانجام دینے کی خواہش مند ہوتی ہیں۔ ایسے میں شوہر یا سسرال معاون ثابت نہ ہوں تو وہ رشتہ ازدواج منقطع کر دیتی ہیں جس پر معاشرے میں انہیں باغی، ناشکرا اور نافرمان کا فتوی لگ جاتا ہے۔

اسلام طبقاتی، معاشی، قبائلی و خاندانی حیثیت کے فرق کے باوجود مسلمانوں کو برادرانہ تعلق کی بنا پر برابری کا سلوک کرنے کی ترغیب دیتا ہے۔ رسول اللہ نے یہ تعلیم عام کرنے کے لیے اپنے خاندان سے ابتداء کی یعنی اپنی پھوپھی زاد زینب بنت جحش کا نکاح اپنے آزاد کردہ غلام زید بن حارثہ سے کیا۔ اس دور اور معاشرت میں غلام لونڈی چونکہ کم حیثیت افراد تھے لہٰذا سیدہ زینب ناگواری محسوس کرتیں، سیدنا زید رسول اللہ سے ان کے رویے کی شکایت بھی کرتے، رسول اللہ جواباً نباہ کی تلقین کرتے، بالآخر حالات بہتر نہ ہونے کے باعث ایک سال بعد سیدنا زید نے طلاق دے دی۔ معاشرتی رواج کے زیر اثر ذہن اگر کم حیثیت فرد کو بطور شوہر عزت و اکرام دینے اور اپنے اوپر سربراہی کا درجہ دینے میں ناگواریت محسوس کر رہا تھا تو خدا نے اس پر بذریعہ وحی غضب ظاہر نہ کیا اگرچہ وہاں تو یہ جواز بھی تھا کہ انھیں رسول کی براہ راست تربیت میسر تھی، تو پھر آج کی عورت پر ان فتاوی کا جواز کیا ہے؟

جبکہ معاملہ یوں ہے کہ مرد ہو یا عورت دونوں ہی خدا کی نظر میں مجرم نہیں بشرطیکہ وہ قانون طلاق کے مطابق علیحدگی اختیار کر کے باہم ظلم و زیادتی کے مرتکب نہیں ہوئے۔ اللہ نے دونوں کے لیے اپنی رحمت کی وسعتوں اور نئے راستوں کی امید دلائی ہے:

وَاِنْ يَّتَفَرَّقَا يُغْنِ اللّٰهُ كُلًّا مِّنْ سَعَتِهٖ (النساء: 130)

البتہ یہ حقیقت اپنی جگہ موجود ہے کہ جس قدر غیر معمولی اہمیت کا حامل یہ ادارہ نکاح ہے، خدا اپنے بندوں سے بھی یہ تقاضا کرتا ہے کہ وہ اس ادارے کی بقا کو اپنے معاملات میں ترجیحی مقام دیں، یہی وجہ ہے کہ رسول اللہ نے بغیر جائز عذر کے طلاق لینے والی عورت سے متعلق فرمایا کہ وہ جنت کی خوشبو سے محروم ہو گی۔ (310/1، باب الخلع، ط: حقانیہ: سنن ابی داؤد)

3۔ بہو بیٹیوں کا اپنے میکے بیٹھ کر شوہر سے مطالبات منوانے کی عادت بھی ہمارا روزمرہ معاشرتی مشاہدہ ہے۔ اس کے پس منظر میں عمومی سوچ یہ ہے کہ کسی بھی سسٹم میں ماتحت افراد جب تک کام جاری رکھیں سربراہان کی جانب سے ان کے مطالبات پر کان نہیں دھرا جاتا لیکن جیسے ہی کام کا بائیکاٹ کر دیا جائے تو کافی حد تک منظوری مل جاتی ہے۔ جو لوگ ان تراکیب سے حصول مقصد میں کامیاب ہوتے ہیں وہ اسی اسلوب کا پرچار گردو پیش کے افراد

میں کرتے ہیں۔

افکار و اطوار اسی طرح رواج پا کر تہذیب و اقدار کی شکل ہی بدل دیتے ہیں۔ زمانہ جاہلیت میں مرد بیوی کو بار بار طلاق دے کر گھر بھیجتے پھر رجوع کر لیتے یوں ساری عمر نہ وہ ٹھیک طرح شوہر کے ساتھ بس پاتی نہ آگے نکاح کر کے اپنی نئی زندگی شروع کر پاتی۔ اللہ تعالیٰ نے خواتین کو اس زبوں حالی سے نکالنے کے لیے قانون طلاق نازل کر کے مردوں کو پابند کر دیا کہ اب اگر وہ اپنی بیوی کو طلاق دے کر میکے بھیجیں گے تو صرف دو مرتبہ صلح اور رجوع کر کے ایک ساتھ رہ سکتے، تیسری مرتبہ یہ عمل دہرانے پر رجوع کا راستہ باقی نہ رہے گا۔(البقرہ:229-230)

دور جاہلیت میں مردوں کا عادتاً بیویوں کو گھر سے نکال میکے بٹھائے رکھنا ہو یا عصر حاضر میں خواتین کا بذات خود جا بیٹھنا ہو بہر صورت اس کی چوٹ سیدھا ادارہ نکاح کے نظام پر پڑتی ہے۔ ایفائے عہد مومن کی پہچان ہے، مرد و عورت کا معاہدہ نکاح اپنی اصل میں محفوظ ادارے اور مستحکم نظام کی فراہمی ہے اور جب اسی نظام کو تلپٹ کرنے والے اسلوب اپنائے جائیں تو عین ممکن ہے شوہر یا بیوی تو اپنے مطالبے و مقصد میں کامیاب ہو جائیں مگر یہ کامیابی ادارہ نکاح کے اولین مقصد پر کاری ضرب لگا کر ملتی ہے۔

مرد و عورت سے مطلوب رویہ

مرد یا عورت اگر مخصوص معاشی معیار، طرز رہن سہن یا پیشہ ورانہ زندگی کا نصب العین رکھتے ہیں تو ضروری ہے کہ معاہدے میں داخل ہوتے وقت بطور شرائط انھیں طے کر لیں، تاکہ فریقین ایک دوسرے کے متعلق کسی ابہام یا گمان کا شکار نہ ہوں اور واضح متعین شرائط کے ساتھ یا تو معاہدے میں داخل ہوں یا رضامندی نہ ہو تو ان کے مابین رشتہ سرے سے قائم ہی نہ کیا جائے۔ معاہدے میں داخلہ سنجیدگی اور ذمہ داری سے ہو نا کہ لاابالی و جذباتی پن سے تاکہ آئندہ زندگی میں ہر اقدام رشتہ ازدواج کے اولین مقصد کو ملحوظ رکھ کر اٹھایا جائے۔

سفر نامہ

نسرین خان

جب دل دروازے بنے!

بہت خوش قسمت ہوتے ہیں وہ لوگ جن کے سفر وسیلہ ظفر بن جاتے ہیں۔ اگرچہ محترمہ نسرین خاں کا سفرِ امریکا کوئی پہلا سفر نہیں تھا لیکن کئی حوالوں سے یہ سفر ان کی زندگی کا ایک نہ بھولنے والا تجربہ بن گیا۔ اس میں وہ آگہی اور شعور کے کن کن لمحات سے گزریں اور اس کا ان کے دل و دماغ پر کیا اثر ہوا، یہ سفر نامہ اسی کا ایک دل نواز بیان ہے۔

میں امریکہ کسی فکری یا علمی منصوبے کے تحت نہیں گئی تھی۔ یہ سفر دراصل ایک بہن کے لیے تھا۔ میری بڑی بہن نسیم حفیظ—جو میرے لیے ہمیشہ ماں کی طرح رہی ہیں—ان کے گھٹنے کی ریپلیسمنٹ سرجری طے تھی۔ دل میں بس یہی نیت تھی کہ ان کے پاس رہوں، ان کی خدمت کروں، اور ہمیں اکھٹے وقت گزارنے کا موقعہ ملے گا۔ میں نے سوچا تھا کہ یہ دو ہفتے صرف تیمار داری کے ہوں گے۔۔۔ خاموشی، دعا اور خدمت کے۔

لیکن بعض اوقات اللہ تعالی ہمارے معاملات ہماری سوچ اور سفر کو ہماری نیت سے کہیں زیادہ وسیع کر دیتا ہے۔ وہ دو ہفتے محض ایک بہن کی دیکھ بھال تک محدود نہیں رہے۔ وہ میرے لیے رشتوں کی بازیافت بن گئے۔ امریکہ میں میرا خاندان پھیلا ہوا ہے—چچا، کزنز، بھانجے، بھانجیاں، بہن، بہنوئی—سب کے ساتھ وقت گزارنے کا موقع ملا۔ کہیں بیٹھ کر پرانی باتیں ہوئیں، کہیں ہنسی گونجی، کہیں خاموشی نے رشتہ مضبوط کیا۔ ایک طرف بہن کی خدمت، دوسری طرف خاندان کی قربت—یہ امتزاج میرے دل کو ایک عجیب طرح کے سکون سے بھر رہا تھا۔ میں نے امریکہ کو ایک ملک کے طور پر نہیں دیکھا، بلکہ ایک بکھرے ہوئے خاندان کے دل کی طرح محسوس کیا۔

فلوریڈا میں بہن کے پاس قیام کے بعد میں ڈیلس اور ٹلہاسی بھی گئی، جہاں میرے بھتیجے اور بھتیجیاں رہتے ہیں۔ یوں یہ محض سفر سے زیادہ تعلق کی بازیافت کا سفر بن گیا۔ اور اسی سفر کے دوران ایک اور ملاقات میرا انتظار کر رہی تھی— ایک ایسی ملاقات جو دراصل ملاقات نہیں، بلکہ ایک طویل فکری و روحانی نسبت کی تجدید تھی۔

جی ہاں! استاد محترم جناب جاوید احمد صاحب غامدی سے ملاقات۔

ان سے میرا تعلق آج یا کل کا نہیں۔ میں ان سے پہلی مرتبہ 1986 میں ملی تھی۔ اس وقت سے لے کر آج تک یہ تعلق مختلف صورتوں میں میرے ساتھ چلتا رہا—درس، لیکچرز، نشستیں، سوالات، اور مکالمے۔ میں یہ بات پورے شعور اور شکر کے ساتھ کہہ سکتی ہوں کہ جن خواتین نے جاوید صاحب۔۔۔۔ معاف کیجیے گا، میں انھیں جاوید صاحب لکھ رہی ہوں۔۔۔ اصل میں یہی نام تھا جس سے مجھے واقفیت ہوئی تھی، اس لیے "غامدی" صاحب کے بجائے مجھے اسی نام سے انھیں لکھنا اور مخاطب کرنا زیادہ اچھا لگتا ہے! خیر، میں نے انھی سے دین کو سمجھا، بے شمار سوالات کیے اور شعور کے ساتھ دین کو اپنایا—اسی لیے میں شاید اوّلین میں سے ہوں۔ یہ نسبت میرے لیے اعزاز بھی ہے اور ذمہ داری بھی۔

ڈیلس میں ان کے ساتھ گزارے گئے یہ دن محض حال کی باتیں نہیں تھے۔ یہ ماضی اور حال کے درمیان ایک پل تھا۔ ہم نے وہ زمانے بھی یاد کیے جب وہ لاہور میں مختلف گھروں میں قیام کرتے رہے تھے، جب جب، جہاں جہاں درس ہوتا، میں ایک طالبہ کی طرح ان کی باتیں سننے جایا کرتی تھی۔ میرے اندر بے شمار سوالات کلبلاتے رہتے تھے۔۔۔۔۔ وہ مجھے اُن کے ہر درس میں کھینچ لے جاتے تھے۔ 1986 سے لے کر آج تک—وہ تمام ادوار جیسے ایک لمحے میں سمٹ آئے ہوں۔ یہ میرے لیے بہت جذباتی بھی تھا اور بہت اطمینان بخش بھی۔ ان دو دنوں میں اُن کے ساتھ سوال و جواب کا وسیع سلسلہ رہا۔ یہ حسرت ناتمام بھی تمام ہوئی کہ جی پھر سوال ہوں، کئی روک ٹوک، کوئی تحدید نہ ہو۔

سب سے پہلے میں نے ان کے سامنے وہ سوال رکھا جو میرے دل کا درد ہے۔۔ ایک کانٹا جو نہ جانے کب سے ایک ماں کے دل میں ترازو ہے۔ بچوں کا دین سے دور ہونا، مذہب سے بیزاری، عمل سے لاتعلقی—

جاوید صاحب نے بہت سادگی مگر بہت گہرائی سے بات کی۔ انہوں نے کہا کہ سب سے پہلے تو خود کو قصوروار سمجھنا بند کریں۔ کیونکہ یہ مذہب بے زاری آج ہر دوسرے گھر کا مسئلہ ہے۔ انھوں نے کہا: جب اولاد شعوری عمر میں داخل ہو جائے، تو دین کا تقاضا یہ ہے کہ فیصلے کا حق اسی کا ہو۔ والدین کا کردار اب حکم دینے والا نہیں بلکہ ساتھ چلنے والا ہونا چاہیے۔ مشورہ بھی تب، جب وہ خود مانگیں۔

سب سے مشکل بات میرے لیے یہ تھی—اور شاید سب سے ضروری بھی—کہ اولاد کو کبھی یہ دھمکی نہ دی جائے کہ اگر انہوں نے کوئی ایسا فیصلہ کیا جو ہمیں دین کے خلاف لگتا ہے تو ہم تعلق توڑ لیں گے۔ یہ دھمکی دین کو خوف بنا دیتی ہے اور محبت کو زہر۔

یہ سب میرے لیے صرف ایک سماجی مسئلہ نہیں تھا، بلکہ ایک ذاتی کرب تھا۔ میں بار بار خود سے پوچھتی رہی کہ کیا تربیت میں کہیں کوئی بنیادی کمی رہ گئی؟ کیا میں نے کچھ چھوڑ دیا؟ یا شاید کچھ زیادہ کر دیا؟ اس سوال کے ساتھ ایک گہرا احساسِ ندامت اور گِلٹ بھی جڑا ہوا تھا۔

جاوید صاحب نے میرے سوال کا جواب دینے سے پہلے میرے دل کے بوجھ کو دیکھا۔ انہوں نے بڑے سکون سے کہا کہ اس معاملے میں میں خود کو مجرم نہ ٹھہراؤں۔ یہ صرف ایک گھر یا ایک ماں کا مسئلہ نہیں، بلکہ اس دور کی آزمائش ہے۔ آج کا نوجوان ایک ایسے فکری ماحول میں سانس لے رہا ہے جہاں الحاد، سوشل میڈیا، ٹیکنالوجی اور عالمی بیانیے مسلسل اس کے ذہن پر اثر انداز ہو رہے ہیں۔ اُن کا میرے دکھ کو محسوس کرنا اور انتہائی دردمندی سے جواب دینا۔۔۔ میرے اندر جیسے کوئی سخت گرہ آہستہ آہستہ کُھل رہی تھی۔ گویا بند گلی سے ایک دم روشن راستے پر آ گئی۔ پہلی بار مجھے اپنے آپ سے ہمدردی ہوئی کہ نسرین اصل میں یہ بوجھ اکیلے اٹھانے کا تھا ہی نہیں۔

ان کی باتوں میں ایک لفظ بار بار ابھر کر سامنے آیا کہ حل بات چیت ہے، مکالمہ ہے، نہ جبر، نہ غصہ، نہ خوف۔ بچوں کے ساتھ کھڑا ہونا، ان کے سوال سننا، ان کی الجھنوں کو برداشت کرنا، اور سب سے بڑھ کر ان کے انسان ہونے کا احترام کرنا۔

یہ والدین ہونے کا لازمی تقاضا ہیں۔ انہوں نے کہا کہ بچے خدا کے بندے ہیں، اور خدا نے انہیں سوچنے اور فیصلہ کرنے کا حق دیا ہے۔ یہ بات میرے دل میں بہت گہرائی تک اتر گئی۔ مجھے لگا کہ شاید ہم اکثر دین کو محبت کے بجائے حکم اور ناگزیر ڈسپلن کے طور پر پیش کر دیتے ہیں، اور یہی وہ مقام ہے جہاں رشتے میں دراڑ پڑتی ہے۔ ان کی باتوں میں اللہ نے عجب تاثیر رکھی ہے کہ میں نے محسوس کیا کہ میرا دل کھل رہا ہے۔ میں اس بات کو قبول کرنے کے قریب آ گئی کہ یہ میری بیٹیاں سب سے پہلے اللہ کی بندیاں ہیں۔ ہدایت دینا میرا کام نہیں۔ اللہ جب ہدایت دیتا ہے تو اپنے وقت، اپنے قانون اور اپنے اصول کے مطابق دیتا ہے۔

پھر گفتگو ذاتی دائرے سے نکل کر عالمی منظر نامے تک پہنچی۔ میں نے ان سے آج کے ایک اور بڑے مسئلے پر بات کی — کریکٹر، اے آئی، الحاد اور نئی نسل میں پھیلتا ہوا بے سمت فکری رجحان۔

انہوں نے اس مسئلے کو بہت محبت سے سنا۔ ان کے نزدیک یہ محض بغاوت نہیں بلکہ ایک عالمی پروپیگنڈا ہے، جس کا شکار ہماری نئی نسل ہو رہی ہے۔ انہوں نے صاف کہا کہ اس کا جواب نہ لڑائی ہے، نہ جھگڑا، نہ جبر۔ اس کا جواب دعا، محبت، شعور اور مکالمہ ہے۔ ہمیں اپنی نئی نسل کے مقابل نہیں، ان کے ساتھ کھڑا ہونا ہے۔ صرف پیار سے، سمجھ سے اور سچائی ہی سے اس بیانیے کا جواب دیا جا سکتا ہے۔

نئی نسل کی فکری بے سمتی صرف ہمارے معاشرے تک محدود نہیں، یہ ایک عالمی کیفیت ہے۔ جاوید صاحب نے اسے بین الاقوامی فکری پروپیگنڈا قرار دیا اور کہا کہ اس وقت ہمارے پاس مکالمے کے سوا کوئی مؤثر راستہ نہیں۔ یہ بات میرے لیے بہت معنی خیز تھی، کیونکہ اس نے مجھے ردِ عمل سے نکال کر فہم اور صبر کی طرف منتقل کیا۔

پھر گفتگو پاکستان کے حالات کی طرف مڑ گئی۔ میں نے اُن کے سامنے اپنی تشویش رکھی کہ ہمارے ملک میں بنیادی انسانی حقوق کی پامالی ہمیں کس سمت لے جا رہی ہے اور یہ تلخ حقیقت کہ فوج اپنے ہی لوگوں پر ظلم کرتی نظر آتی ہے۔

جاوید صاحب نے کہا کہ اس پر وہ اپنا موقف پہلے ہی کھل کر ریکارڈ پر لا چکے ہیں۔ ان کے نزدیک، چونکہ فوج پیچھے ہٹتی دکھائی نہیں دے رہی — جو اخلاقی طور پر غلط ہے مگر عملی حقیقت بن چکی ہے — اس لیے اب شاید آئین میں فوج کے کردار کے حوالے سے کوئی واضح اور متعین فریم ورک بنانا ناگزیر ہو چکا ہے، تاکہ غیر اعلانیہ طاقت کے بجائے ایک آئینی حد قائم ہو سکے۔

انسانی حقوق، سیاسی عدم استحکام، عوام کی بے بسی پہ بات کرتے ہوئے ان کی گفتگو میں جذبات کے بجائے حقیقت پسندی تھی۔ کچھ باتیں سننا آسان نہیں ہوتیں، مگر ان پر بات کیے بغیر راستہ بھی نہیں نکلتا۔ میں نے محسوس کیا کہ یہ سیکھنا بھی شعوری مسلمان ہونے کے سفر کا حصہ ہے کہ ہم نعروں کے بجائے سمجھ کے ساتھ سوچیں۔

ایک اور ذاتی سوال جو میں نے اُن کے سامنے رکھا کہ دو انسان ایک ہی آزمائش میں ہوتے ہیں، ایک کے لیے راستہ کھل جاتا ہے اور دوسرا وہیں رک جاتا ہے—دونوں بالکل ایک جیسی صورتِ حال سے گزرتے ہیں، ایک ہی نوعیت کی آزمائش میں ہوتے ہیں، مگر ایک کو اللہ تعالیٰ ہدایت دے دیتا ہے، اس کی مشکل آسان ہو جاتی ہے، جبکہ دوسرا اسی مشکل میں الجھا رہتا ہے۔ یہ فرق کیوں ہوتا ہے؟

اس کے جواب میں انہوں نے نہایت خوبصورتی سے یہ بات سمجھائی کہ ہدایت صرف حالات کا نتیجہ نہیں ہوتی، بلکہ نیت، طلب اور اللہ سے تعلق کا معاملہ ہوتی ہے۔ بعض اوقات ہمیں یوں محسوس ہوتا ہے کہ ایک شخص کو مشکل وقت میں فوراً راستہ مل گیا، اور دوسرا وہیں کا وہیں رہ گیا—لیکن اس فرق کے پیچھے انسان کے دل کی سمت، اس کی نیت اور اس کا خدا سے باطنی رشتہ کارفرما ہوتا ہے۔ انہوں نے حضرت یوسف علیہ السلام کی مثال دی کہ جب وہ ایک نہایت کٹھن آزمائش میں مبتلا ہوئے—زِلیخا کے فتنے میں—تو اللہ تعالیٰ نے انہیں اس مشکل سے بچا لیا، اس لیے نہیں کہ آزمائش نہیں تھی، بلکہ اس لیے کہ حضرت یوسف کی نیت اس گناہ سے بچنے کی تھی۔ ان کا دل اللہ کے سامنے جھکا ہوا تھا، اور وہ اندر سے پاکیزگی کے طالب تھے۔ اللہ تعالیٰ انسانوں کے ساتھ بھی یہی معاملہ کرتے ہیں، جو دل سے بچنا چاہتا ہے، جس کی نیت درست ہوتی ہے، اور جس کا تعلق اللہ سے زندہ ہوتا ہے—اللہ اس کے لیے راستے بنا دیتے ہیں۔

گویا ایک جیسی آزمائش، مگر انجام مختلف! فرق حالات کا نہیں، نیت اور خدا سے تعلق کا ہوتا ہے۔ جو دل سے بچنا چاہے، اللہ اسے بچا لیتے ہیں۔ حضرت یوسف اس کی روشن مثال ہیں۔ اس مثال نے مجھے یہ سمجھایا کہ ہدایت کوئی اتفاق نہیں، بے ضابطہ نہیں بلکہ ایک اندرونی آمادگی کا نتیجہ ہوتی ہے۔ اللہ دلوں کے حال دیکھتا ہے۔

اس پورے قیام کا سب سے تسلی بخش لمحہ میری بیٹی نیہا اور جاوید صاحب کی طویل گفتگو تھی۔ نیہا نے اپنے دل میں موجود تمام سوالات—مرد و عورت کے فرق، چار شادیوں، وراثت اور تشدد سے متعلق آیات—بغیر کسی خوف کے ان کے سامنے رکھ دیے۔ تقریباً دو گھنٹے کی اس گفتگو کو میں خاموشی سے سنتی رہی۔ اس لمحے مجھے پہلی بار شدت سے یہ احساس ہوا کہ میرا بچہ مذہب سے بھاگ نہیں رہا، بلکہ سمجھنا چاہ رہا ہے۔ جاوید صاحب نے ایک ایک سوال کو بڑے تحمل اور محبت سے سنا اور جواب دیا۔ میرے لیے یہ بہت بڑا اور اہم لمحہ تھا کہ میری بیٹی—جو عام طور پر ایسی باتیں سننے کو تیار نہیں ہوتی—اس دن اُس نے نہ صرف یہ باتیں سنی، بلکہ غور کرنے کی آمادگی بھی ظاہر کی۔ یہ میرے لیے سکون، امید اور شکر کا مقام تھا کہ ایک دروازہ کھلا تھا۔ اور شاید یہی سب سے بڑی کامیابی تھی۔

ان دنوں جاوید صاحب کے خاندان کے ساتھ گزارا گیا وقت میرے لیے بہت قیمتی رہا۔ وہ غیر رسمی گفتگو، پرانی

یادیں، اور وہ ماحول—جہاں جاوید صاحب کی بیگم، بیٹی، داماد، بیٹا، بہو، اور گرینڈ چلڈرن سب موجود تھے—میرے لیے یہ بے حد خوش گوار یادیں سمیٹنے والے لمحات تھے۔ حسن الیاس کی شائستگی، دھیمے پن اور ذہانت نے مجھے متاثر کیا۔ ان کی شخصیت میں کچھ ایسی خوبیاں ہیں جو فوراً محسوس ہو جاتی ہیں—سادگی، سنجیدگی، ذہانت، شائستگی اور مقصدیت۔ یہ وہ اوصاف ہیں جو واقعی باکمال انسانوں کی پہچان ہوتے ہیں۔ مجھے یوں لگا کہ ان کو جاننا، سمجھنا اور دیکھنا بھی میرے امریکا کے مجموعی تجربات کا ایک قیمتی حصہ ہے۔ غامدی سینٹر کا وزٹ—جو ایک دیرینہ دعا تھی—میرے لیے محض ایک جگہ دیکھنا نہیں تھا، بلکہ اس بات کی تصدیق تھی کہ جب علم اخلاص کے ساتھ جڑ جائے تو وہ ادارے نہیں، امید کے چراغ بن جاتے ہیں۔

جب میں اس پورے سفر کو دیکھتی ہوں تو مجھے صاف نظر آتا ہے کہ یہ محض امریکا کے چند دن نہیں تھے۔ یہ میرے اپنے اندر کے سفر کی ایک اہم منزل تھی۔ یہ ایک ماں کی بے چینی، ایک طالبہ کی جستجو، اور ایک عورت کے شعوری ایمان کی کہانی تھی۔ جاوید صاحب کے ساتھ میرا تعلق صرف استاد اور شاگرد کا نہیں، بلکہ ایک ایسے رہنما کا ہے جس کے ساتھ چلتے ہوئے میں نے دین کو خوف نہیں بلکہ روشنی کے طور پر سمجھا۔ اگر میں آج پیدائشی مسلمان سے شعوری مسلمان کے سفر میں کہیں کھڑی ہوں تو اس میں اس چالیس سالہ رفاقت کا کردار بہت گہرا ہے۔

میں یہ تحریر صالحات کی قاری خواتین کے ساتھ اس امید کے ساتھ شیئر کر رہی ہوں کہ شاید میری کیفیتیں کسی اور کے دل کی آواز بن جائیں۔ کیونکہ ہم میں سے بہت سی خواتین ایک ہی طرح کے سوالات، ایک ہی طرح کے خدشات، اور ایک ہی طرح کی امیدیں لیے جی رہی ہیں۔ اور شاید اس عہد میں دین کے ساتھ جڑے رہنے کا سب سے سچا راستہ یہی ہے کہ ہم روشنی کی طرف سفر جاری رکھیں—خاموشی، مکالمے اور سچائی کے ساتھ۔ آخر میں یہ دعا ہے کہ:

اے اللہ! ہمیں وہ دل عطا فرما جو سوال کرنے سے نہ ڈرے، وہ عقل دے جو سمجھنے کا حوصلہ رکھتی ہو، اور وہ ایمان عطا فرما جو خوف نہیں، روشنی پیدا کرے۔ ہمیں اور ہماری نسلوں کو حق کو پہچاننے، اس پر ٹھہرنے اور محبت کے ساتھ اسے جینے کی توفیق دے۔ آمین۔

ثوبیہ نورین

لڑائی جھگڑے

ہمارے معاشرے میں باہمی رشتے اکثر تلخیوں کا شکار رہتے ہیں۔ اس مضمون میں ثوبیہ نورین نے ان تلخیوں کی وجوہات کا جائزہ لیا ہے اور ان کی نشان دہی کرتے ہوئے انھیں ختم کرنے یا انھیں کم کرنے کے بہت تیر بہدف طریقے بتائے ہیں۔

پندرہ سالہ حارث، بال سے کھیلتے ہوئے کمرے میں داخل ہوا۔ اور داخل ہوتے ہی قدرے خفگی سے بولا:

"اماں! ایک تو آپ اور ابا رشتہ داروں سے قطع تعلقی کر کے بیٹھے ہوئے ہیں۔"

جملہ ختم نہ ہوا تھا کہ حارث کی والدہ تبسم کے ماتھے پر بہت سی شکنیں ابھر آئیں۔ غصے میں بولیں:

"مطلب کیا ہے تمہارا؟ ہم قطع تعلقی کر کے بیٹھے ہوئے ہیں؟"

حارث بولا: "کیا ہو گیا؟ اتنا غصہ کیوں کر رہی ہیں؟"

"کیا غصہ کر رہی ہوں؟ بتاؤ تم!"

"ہاں تو، اتنے عرصے سے ہم آپ لوگوں کی وجہ سے لاہور نہیں جا سکے۔"

"تو اس کا مطلب ہے کہ آپ خود سے الزام لگانا شروع کر دیں!" وہ تنک کر بولیں۔

"مجھ پر کیوں چیخ رہی ہیں؟"

اب تبسم کو واقعی غصہ آ چکا تھا۔

"اندازہ بھی ہے تم لوگوں کو حقیقت کا؟ تم بتاؤ کہ ہم نے ان لوگوں کو کہا کیا تھا؟ ہم نے تو الٹا مسئلہ حل کرنے کی کوشش کی تھی، سلجھا رہے تھے۔۔۔" وہ بولتی چلی گئیں۔

حارث منہ بنا کر، بڑبڑاتا ہوا، دروازہ پٹخ کر چلتا بنا، اور تبسم وہیں جلتی رہ گئیں۔

دو دن بعد جذبات مدھم ہو چکے تھے، موڈ خوشگوار تھا۔ تبسم کے غور و فکر اور بعد از گفتگو جب مسئلہ سلجھا تو تصویر کے دوسرے رخ کی تفصیلات کچھ یوں سامنے آئیں۔

"قطع تعلقی" کا لفظ سنتے ہی تبسم کے ذہن میں بے شمار باتیں ابھر آئیں۔ مثلاً قطع تعلقی جس سے اللہ تعالیٰ نے سختی سے منع فرمایا ہے۔ کیا ہم اتنا بڑا گناہ کر رہے ہیں؟ نبی کریم ﷺ نے ہر صورت صلہ رحمی کا حکم دیا ہے، اور یہ میرا بچہ ہمیں ہی قطع تعلقی کرنے والا کہہ رہا ہے۔

ساتھ ہی پچھلے واقعات کی بے شمار جھلکیاں ان کے ذہن میں ابھر آئیں، جن میں وہ صرف اپنا کردار دیکھ رہی تھیں۔ انہوں نے رشتہ داروں کے مسئلے کو سمجھنے کے لیے وقت لگایا، سب سے بات چیت کی، الزامات کے بارے میں سوال کیے، اور جب معاملہ حد سے بڑھ گیا تو حکمتِ عملی کے تحت وہاں سے واپس آ گئیں۔

یہ ساری کہانی ذہن میں آتے ہی وہ حارث پر برس پڑیں اور غصے میں سوالوں کی بوچھاڑ کر دی۔

چلیں مانا کہ ایسا ہی ہوتا ہے۔ انسان کسی بھی صورتِ حال میں سب سے پہلے اپنے ہی زاویۂ نظر سے سوچتا ہے۔ دوسرے لوگ ان کے مسئلہ حل کرنے اور چلے آنے کو کیسے دیکھ رہے تھے؟ یہ پھر کبھی بتاؤں گی، کیونکہ یہ ایک اور جھگڑا ہے۔

لیکن فی الحال زیرِ بحث پہلا تنازع یہ ہے کہ:

کیا حارث واقعی یہی کہنا چاہ رہا تھا؟

کیا وہ ماں باپ کی اس کاوش سے واقف تھا؟

کیا اسے مسئلے کی حقیقت معلوم تھی؟

یا وہ واقعی اپنی والدہ تبسم پر الزام لگا رہا تھا؟

یا حارث کے ذہن کی کہانی کچھ اور تھی؟

جی ہاں، بالکل مختلف۔

وہ تو صرف یہ کہنا چاہ رہا تھا کہ وہ اپنے کزنز کو یاد کر رہا ہے۔ لاہور جانا، گھومنا پھرنا، ان کے ساتھ کھیلنا اور وہ سب مزے اسے یاد آ رہے تھے۔ اسے سمجھ ہی نہیں آ رہی تھی کہ اس کی امی کیا باتیں کر رہی ہیں۔

امی کے جملوں کا شور، تبسم کے سوالات اور حقیقت سمجھانے کی کوشش، سب اس کے لیے محض شور تھا، اسی لیے وہ

جھنجھلا کر دروازہ پٹخ کر چلا گیا۔

حارث اپنی فراغت اور بوریت سے اکتا کر، اپنے کزنز کے ساتھ لطف اندوز ہونے کے احساسات اپنی امی کے پاس بیان کرنے آیا تھا۔

یہ ہے پہلا مسئلہ:

ہمارے جملے اور الفاظ اکثر وہ نہیں ہوتے جو ہم کہنا چاہتے ہیں، جس کے باعث شدید رابطے کی خرابی پیدا ہو جاتی ہے۔ تبسم نے ایک لفظ سنتے ہی اپنے ذہن میں موجود سابقہ یادداشت کے مطابق ردِ عمل دیا۔ وہ یہ سمجھ نہ سکیں کہ اچھی نیت اور اچھے عمل کے باوجود انہوں نے کسی سے رشتہ نہیں توڑا، پھر یہ الزام کیوں؟

دوسرا مسئلہ:

ہم دوسروں کے الفاظ کے معانی، خود ان سے سمجھے بغیر، اپنے ذہن میں موجود معلومات، تجربات اور فہم کی بنیاد پر طے کر لیتے ہیں۔

مسئلے کا حل یہ ہے کہ جب بھی کسی کے الفاظ ناگوار گزریں تو رک کر سوال کریں اور بات کو پوری اہمیت دیں۔

آیئے ایک واقعے سے سمجھتے ہیں۔

میاں بیوی۔۔۔ سعد اور نازیہ۔۔ بیٹھے تھے اور نازیہ کچھ جگہوں کی تصویریں اپنے شوہر کو دکھاتے ہوئے بولیں:

"یہ جگہ تو بہت خوبصورت ہے، آپ کو پتا ہے یہ کہاں ہے؟"

سعد نے ہلکی سی نظر ڈالی اور روکھے انداز میں بولے

"ہمم۔۔۔"

نازیہ مزید جوش سے بولیں:

"اچھی ہیں نا، بھلا کہاں ہے یہ جگہ؟"

سعد چڑتے ہوئے بولے۔ "تم نے کھانا بنا لیا ہے یا نہیں؟"

نازیہ جذباتی ہو کر بولیں

میں آپ سے کیا بات کر رہی ہوں اور آپ کھانے پر بات کرنا شروع ہو گئے۔" کبھی تو کسی کی بات سن لیا کریں!"

سعد بولے۔ "ہاں، ہاں! تم تو جیسے ساری باتیں سنتی ہو!"

"آپ سے کم از کم زیادہ ہی سنتی ہوں!"

"تمہاری یہی تکرار مجھے زہر لگتی ہے۔۔۔"

آگے کے درجۂ حرارت کا اندازہ آپ کو ہو ہی گیا ہو گا۔

چار دن کی ناراضی اور خاموشی کے بعد جب درجۂ حرارت کم ہوا اور کچھ دھند چھٹی تو اصل تفصیل سامنے آئی۔

نازیہ سردیوں کی چھٹیوں کے لیے کسی قریبی تفریحی مقام کی تلاش میں تھیں کہ ایک خوبصورت جگہ کی ویڈیوز نظر سے گزریں۔ وہ یہ دیکھانے اپنے شوہر کے پاس آئیں کہ کبھی کسی سال وہاں جانے کا سوچا جا سکتا ہے۔

سعد صاحب تصویریں دیکھتے ہی اپنے ذہن کے ڈیٹا کے سمندر میں بہہ گئے۔

"نیا خرچہ، بجٹ پہلے ہی ختم ہے، اتنی دور کی جگہ، گاڑی کا مسئلہ، بچوں کو سنبھالنا، کم چھٹیاں۔۔۔"

یہ سوچیں سونامی کی طرح آئیں اور اتنی ہی تیزی سے باہر تباہی مچا گئیں۔

تیسرا مسئلہ یہ ہے کہ

ہم دوسروں کے عمل کی نیت اور محرک بھی خود ہی طے کر لیتے ہیں، اور پھر اپنے ہی خوف کو جواب دیتے ہیں۔

سعد صاحب نے خوف میں کھانا مانگ لیا، اور آگے جذبات کا طوفان آ گیا۔

اب سوال یہ ہے: کیا وہ اب ریلیونٹ بھی تھا؟

حقیقت یہ ہے کہ ہم اپنی ذمہ داریوں کے بوجھ تلے اس قدر لاشعوری طور پر جینے لگے ہیں کہ انسانوں کو سمجھنا اور تعلقات پر غور کرنا ہمارے لیے اہم ہی نہیں رہا۔

حل یہ ہے کہ دوسروں کے اعمال کو ان کی چھوٹی خوشیوں کے طور پر دیکھیں۔ کسی بھی عمل کی اصل وجہ جاننا چند لمحوں کی خوشی اور مضبوط رشتے دے سکتا ہے۔

اگر بچے نئے بیٹ بال، نئی باربی گڑیا، سکول سے چھٹی، کسی خاص ڈریس کی تعریفیں، مرسڈیز کے قصے، پلے سٹیشن کی نئی ٹیکنالوجی، آئی فون کے نئے ماڈل کے ایڈز دکھا رہے ہوں، تو ایسے تمام مواقع پہ ماں باپ اور بچوں کے درمیان ختم نہ ہونے والی بحث و تکرار شروع ہو جاتی ہے۔ مثلاً والدین کچھ اس طرح ری ایکٹ کرتے ہیں۔

والد (فرسٹریشن سے جواب دیتے ہیں): یار ابھی تین ہفتے پہلے تمہیں نیا بیٹ بال لے کر دیا ہے۔ کتنے بلے چاہیں تمہیں؟ پڑھائی پہ تو کوئی فوکس نہیں ہے تمہارا!"

والدہ (ذہن میں صفائی کے معاملات سے تنگ آ کر کہتی ہیں) بیٹا آپ کے پاس تو پہلے سے گڑیا ہے۔

بچی: مگر وہ ایسی تو نہیں ہے۔

تو پھر بیٹا آپ انہی سے گھر بھر لو۔ پہلے والی سنبھالی نہیں جاتی۔ نئے شوق جان نہیں چھوڑتے، پورے گھر میں کھلونے بکھرے پڑے ہوتے ہیں۔

بیٹے: تو پھر۔۔۔ جو بھی ہو۔۔۔۔ مجھے چاہیے یہ سب کچھ!

والدین: تم لوگوں کی حرص ختم نہیں ہوتی۔ اللہ کا-شکر ادا کیا کرو۔ وہ غبارے بیچنے والا-دیکھ رہے، پاوں میں پھٹا ہوا جوتا پہنا ہوا ہے اس نے۔ تم لوگوں کو کمانا پڑے تو جو مرضی لینا۔۔۔ فراریاں اور مرسیڈیز لینا۔

اب ذرا تجزیہ کیجیے اس گفتگو کا۔ بچوں کی باتوں کا لازم یہ مطلب نہیں کہ وہ ہم سے یہ تقاضا کر رہے ہیں کہ ہم یہ سب ان کو دلائیں۔ وہ بس اپنی خواہشوں اور حسرتوں کا اظہار کر رہے ہیں۔ اس اظہار کو دبانے کا یہ مطلب نہیں کہ آپ نے ان کے دل میں پیدا ہونے والی خواہشات کو جڑ سے اکھاڑ کر پھینک دیا ہے۔ بالکل بھی نہیں۔۔ بس آپ نے انھیں وقتی طور پر دبا دیا۔ وہ اندر تو ہوں گی بس اب آپ کے سامنے نہیں آئیں گی۔

چوتھا مسئلہ

ہم اظہار کی آزادی کا حق بھی نہیں دینا چاہتے۔ یہ بہت پیچیدگیاں پیدا کرتا ہے۔ اسی سے تو معلوم ہو گا کہ تربیت کی ضرورت کہاں کہاں پہ ہے۔ مثلاً ان سب باتوں سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ ہمارے بچے کنزیومرازم کا جو کلچر دیکھ رہے ہیں، وہی بول رہے ہیں۔ مگر والدین اسے ایک ایسی لڑائی میں بدل دیتے ہیں جو بچوں کی سمجھ سے بھی باہر ہوتی ہے۔ ہم سمجھتے ہیں کہ ان سب جملوں اور طنز سے ان کی خواہشات کو لگام ڈل جائے گی مگر وہ صرف یہ جان پاتے ہیں کہ ان کے سامنے یہ باتیں نہیں کرنی چاہیں۔

دن میں کئی بار ایسی ہی چھوٹی چھوٹی باتیں بعد میں بڑے جھگڑوں کا پیش خیمہ ثابت ہوتی ہیں۔ عموماً بچے اپنی دانست میں یہ خواہشات بول کر اپنی چوائسز کا اظہار یا ان اشیا کی تعریف کر رہے ہوتے ہیں۔ آپ کا مسئلہ یہ ہے انھیں افورڈ نہیں کر سکتے یا ان فرمایشوں کو ان کی تربیت کے لیے مناسب نہیں سمجھتے۔ ایسا ہے تو واحد علاج یہ ہے کہ انھیں متبادل دیں۔ ایسا متبادل جو آپ کو بھی پسند ہو ان کو بھی۔

ایک اور قصہ لیں۔ ایک بچی اپنی امی سے بحث کر رہی ہے۔

فضہ: آپ لوگ ہمیشہ بادام پستے ضائع کرتے ہیں۔

"وہ کیسے؟"

"ان بالز (پنیوں) میں ڈال دیتے ہیں سارے۔ گندی، مجھے نہیں پسند! پنیاں وِنیاں۔"

"اچھا تو آپ کو کیا پسند ہے؟"

"پستے اور بادام اسی طرح۔"

"تو ان بالز میں بھی تو یہی ڈلتے ہیں۔"

"ہاں پر ان کا سارا ٹیسٹ بدل جاتا ہے۔ کچھ پتہ نہیں چلتا کہ میں پستہ، بادام ہی کھا رہی ہوں۔"

"واقعی! یہ تو آپ صحیح کہہ رہیں ہیں۔ ان کا ٹیسٹ باقی چیزوں میں مل جاتا ہے۔"

"ہے ناں۔ آپ کو بھی یہی لگتا ہے ناں!"

"ذائقہ بدل تو جاتا ہے، پر مجھے وہ بھی اچھا لگتا ہے۔"

"تو آپ خود کھائیں ناں۔"

اوکے۔ تو آپ کے لئے آئندہ ہم یہ نٹس تھوڑے سے الگ رکھ دیا کریں گے۔"

فضہ ہنستی اور چہکتی جا رہی ہے۔ اس کے کئی الفاظ پر لڑائی اور نصیحتیں شروع ہو سکتی تھیں۔ مگر سمجھ دار ماں نے اسے سب کچھ ایک ساتھ سیکھانے کی جلدی نہیں۔ یہ اس نے کسی اور وقت پر اٹھا رکھیں۔ ابھی کے لیے اس کی فیلنگز اور بات کو سن کر سمجھ لینا مناسب سمجھا۔

اب آپ بھی آغاز کیجئے:

روزمرہ کے لڑائی جھگڑوں میں ان حقائق کو سمجھنے کی۔ آپ بھی یقینا نوٹ کریگے کہ ہم اکثر بحثوں میں جن باتوں پہ گتھم گتھا ہوتے ہیں، وہ ہمارے اپنے ہی دماغوں کی کہانیاں اور کارستانیاں ہوتی ہیں۔ اپنے خیالات و جذبات کی دھند میں ہم دوسروں پہ حملہ آور ہوتے ہیں۔ ہر تنقید اور غصہ کرنے سے پہلے سوال کر کے دوسروں کے الفاظ کے مصداق و مدعا معلوم کیجیے۔ اسی سے ہمیں اپنے ذہنوں کے غبار سے نجات پانے میں آسانی ہو گی۔

افسانہ

نعیم احمد بلوچ

دستک

ایک بیٹی کی باپ کے ضمیر پر دستک۔۔۔ایک گھٹی ہوئی چیخ جسے اس نے چھپن برسوں سے دبا رکھا تھا۔ایک شکایت جسے زبان پر لانے کی ہمت اسے بہت دیر بعد ملی تھی! حقیقی واقعے سے ماخوذ دل کی دہلیز سوالوں کے انبار لگاتا ایک دل پزیر افسانہ

میں نے زندگی میں بہت سے دروازے خود بند کیے تھے، مگر یہ دروازہ۔۔۔یہ میں نے وقت پر چھوڑ دیا تھا۔

چھپن برس۔یہ کوئی حبس بے جا نہیں، یہ ایک خاموشی تھی جو دل میں پلتی رہی۔مزار کے احاطے میں داخل ہوتے ہوئے میرے قدم ٹھہر گئے۔میں نے محسوس کیا کہ میں کسی عمارت کے اندر نہیں، اپنے ماضی میں داخل ہو رہی ہوں۔

دنیا کے لیے یہ ایک بڑا اہم واقعہ تھا۔۔۔ایک بڑے لیڈر کے پر شکوہ مزار پر اس کی بچھڑی، ناراض مگر اکلوتی بیٹی کی حاضری۔حکومت کے نمایندے پورے پروٹوکول سمیت حاضر تھے۔کیمرے، سکیورٹی، رسمی چہرے۔مگر میں ان سب سے بے پروا تھی۔آج میرے دل میں عجیب طوفان تھا۔برسوں اس پر بند باندھے بیٹھی تھی۔

مگر آج اس پر قابو پانا میرے قابو سے باہر ہو رہا تھا۔ اس لیے کہ میرے لیے یہ پہلی بار تھا کہ میں نے خود کو اپنے باپ کے سامنے بغیر کسی خوف کے کھڑا پایا۔ میں نے سفید پتھر کے نیچے منوں مٹی کے نیچے "لیٹے "عظمت کے اس مینار کو اس رشتے سے پکارا، جو میرے لیے سب سے زیادہ معنی رکھتا تھا:

"ابّا"

میں نے یہ لفظ دل میں کہا کیونکہ زبان اب بھی اجازت نہیں دیتی تھی۔ میں دل ہی دل میں بڑبڑائی:

"آپ کے مزار پر ہر چیز سفید ہے۔۔۔ سنگِ مرمر، روشنی، خاموشی۔"

ایک کبوتر کے اڑنے کی آواز میری محویت میں حائل ہوئی۔ شاید وہ مجھے باور کرا رہا تھا کہ خبر دار کوئی گستاخی نہ کرنا۔ مگر کوئی کب تک رکتا۔۔۔ میں اکتا چکی تھی اس بندھن سے۔ کبوتر کے پروں کی پھڑ پھڑاہٹ مدھم ہوئی تو میری روح پھڑ پھڑانے لگی:

"آپ کو سفید رنگ ہمیشہ پسند تھا نا!"

میں نے ایک نظر ماحول پر ڈالی ۔۔۔ یہ نظم، یہ ترتیب، یہ ضبط جو اس وقت باوردی گارڈز میں نظر آ رہا تھا۔ "اور میں؟

میں ہمیشہ رنگ چاہتی تھی۔ شاید اس لیے کہ میں امی جیسی تھی۔"

دھیمے سے لفظوں سے انھیں مخاطب کیا جیسے وہ مجھے ہی سن رہے ہوں۔

امی۔۔۔۔ امی کو یاد کرتے ہی میرے قدم لرزنے لگے۔

وہ ہنستی تھیں تو دنیا آسان لگتی تھی۔ وہ بولتی تھیں تو لفظوں میں جان پڑ جاتی تھی۔ وہ محبت کی دیوی اور حسن کا مجسمہ تھی!" میں انھیں یاد کرانے لگی:

"آپ جانتے تھے نا، ابّا؟ وہ آپ سے محبت میں ہار گئی تھیں۔ انہوں نے اپنا مذہب بدلا، اپنا گھر چھوڑا، اپنی شناخت قربان کی۔۔۔ اور یاد ہے نا ابا! اس دن جب وہ اٹھارہ برس کی ہوئی تھیں۔۔۔ قانونی بلوغت کا دن۔۔۔۔ آپ نے اور امی نے مل کر طے کیا تھا۔۔۔ نانا نے مخالفت کی۔۔۔ تو آپ نے قانون کو ہتھیار بنایا۔ قانون آپ کا ہمیشہ سے ہتھیار رہا۔ پوری زندگی اس ہتھیار سے لڑے لیکن ابا معلوم ہے آپ کو؟ کاش معلوم ہوتا۔۔۔ زمینی حقائق اور جذبات کی دنیا اکثر قانون سے مختلف ہوتی ہے۔ مگر آپ نے کبھی یہ نہ مانا، قانون کا کھیل کھیلتے رہے۔ اس وقت بھی آپ نے امی سے مل کر یہی کھیل کھیلا۔۔۔۔ ٹھیک اٹھارہ برس کی ہوتے ہی امی اپنی شادی کے فیصلے میں آزاد تھیں۔ قانون انھیں نہیں

روک سکتا تھا، اور واقعی نہ روک سکا۔ وہ باپ کے نام کے بجائے آپ کے نام سے منسوب ہونے اپنا محل جیسا گھر چھوڑ کر آپ کے پاس پہنچ گئی۔۔۔ آپ سے بے پناہ اور طوفانی محبت میں انھوں نے یہ سب کچھ کر ڈالا۔۔۔" بہت زیادہ دبانے کے باوجود ایک لمبی آہ میرے سینے سے نکل گئی۔

"اور بدلے میں؟ صرف آپ کی توجہ چاہی تھی۔ لیکن آپ نے قانون کی طرح محبت بھی ناپ تول کر دی۔۔۔۔۔

میں آپ دونوں کے درمیان پلی۔ امی جو آپ ہمیشہ آپ کی توجہ کی طلب میں تڑپتی رہیں، آپ سے بے پایاں محبت کا اظہار چاہتی رہیں۔۔۔ سب کچھ نہیں، آپ کی دنیا نہیں۔۔۔ بس چند لمحے کہ محسوس ہو کہ وہ چاہے جانے کے قابل ہیں ۔۔۔۔۔ مگر آپ کی سیاست جیت گئی، امی ہار گئیں۔ امی کی تمنائیں اور آپ کا ضبط میرے اندر لڑتے رہے۔ آپ مجھے وقت پر سونا، وقت پر کھانا، وقت پر کھیلنا سکھاتے تھے اور امی مجھے خواب دیکھنا سکھاتیں کیونکہ وہ خود خوابوں میں رہتی تھیں۔

آپ مجھے خاموشی سکھاتے تھے، امی مجھے سوال کرنا۔ اور پھر ایک دن!

امی کی موت پر میں نے آپ کو پہلی بار انسان بنتے دیکھا تھا۔

خاموش، ٹوٹے ہوئے، بوڑھے سے۔ حتیٰ کہ روتے دیکھا۔۔۔ زندگی میں پہلی اور آخری بار!

کاش آپ نے اسی دن مجھے بانہوں میں لے لیا ہوتا۔ کاش آپ نے کہا ہوتا:

"اب میں تمھارا باپ ہی نہیں۔۔ ماں بھی ہوں۔۔۔ تمھیں کبھی تنہائی نہ ہو گی۔۔۔۔"

مگر آپ کی انسانیت جاگی تو سہی مگر آپ کی سیاست نے اسے دوبارہ نگل لیا۔ میں ماں کی آغوش سے نکل کر ملازموں کی آغوش میں آگئی۔ وہ مجھے کھاتے پلاتے، میرا خیال رکھتے مگر وہ میرے والدین نہ تھے۔ میں ان کی "محبت" نہیں" ڈیوٹی" تھی۔۔۔ میرے اور آپ کے درمیان فاصلہ رہا۔ آپ یہ فاصلہ چند خطوں اور چند کارڈوں سے پاٹنے کی کوشش کرتے رہے۔ مگر محبت۔۔۔ پدری ہو یا ازدواجی۔۔۔ آپ شاید اس کے تقاضوں نے ناواقفِ محض تھے۔ اس کا احساس آپ کو اُس وقت ہوا جب میں نے وہی کیا جو امی نے کیا تھا۔ میں نے دل کی سنی۔

وہ دن مجھے آج بھی یاد ہے۔ جب میں نے آپ کو بتایا تھا کہ میں نیول سے شادی کرنا چاہتی ہوں۔ یہ الفاظ سن کر آپ کا چہرہ نہیں بدلا،

لیکن آپ کی آنکھوں میں آسمان تک بلند ایک دیوار کھڑی ہو گئی تھی۔

آپ نے کہا تھا:

"There are millions of Muslim boys."

اور میں نے۔۔۔ میں نے وہ جملہ کہا جس نے ہمیں ہمیشہ کے لیے جدا کر دیا:

"There were millions of Muslim girls...why didn't you marry one of them?"

ابّا، وہ جملہ ضد نہیں تھا۔ وہ سوال تھا۔ آخر سوال کرنا تو بچوں کا حق ہوتا ہے نا! آپ قوم کے لیے سوال کرتے رہے مگر اپنی بیٹی کے سوال کو نظر انداز کر گئے۔۔۔ ابا کیا اصول صرف بچوں کے لیے ہوتے ہیں؟

کیا قوم کی خاطر باپ ہونے کی ذمہ داری معطل ہو جاتی ہے؟

لیکن اب، اتنے برس بعد میں خود سے پوچھتی ہوں۔۔۔ کیا میں نے آپ کو چوٹ دی؟ یا آپ پہلے ہی قوم کے بوجھ تلے مجھے کھو چکے تھے؟

آپ نے قوم چنی۔۔۔ میں جانتی ہوں، ابّا۔ شاید آپ کے بغیر قوم کو منزل نہ ملتی۔ لیکن دوبارہ پوچھتی ہوں: کیا قوم کا باپ بنتے ہوئے اپنی بیٹی کا باپ ہونے کی ذمہ داریاں چھوڑنا ضروری تھا؟

آپ اسمبلیوں میں، جلسوں میں، میٹنگز میں بولتے رہے، میں خطوط کا انتظار کرتی رہی۔

آپ نے تاریخ بدلی،

میں نے بچپن ہارا۔

ایسا نہ ہوتا تو شاید میں آج یہاں شکوہ لے کر نہ کھڑی ہوتی۔"

میں کچھ دیر کے لیے رک گئی۔ میرے چہرے کو میرے آنسو دھو رہے تھے۔ میں نہ رہ سکی۔ میں نے دعا کے لیے ہاتھ پھیلا دیے مگر ساتھ یہ ضرور کہا:

"آپ نے اپنی قوم کا خیال رکھا۔ لیکن کیا یہ انسانی رویہ تھا کہ اپنی بیوی اور اپنی بیٹی کو نظر انداز کر دیا جائے؟"

میرا سوال ایک بڑے لیڈر سے نہیں تھا۔ یہ ایک بیٹی کا اپنے باپ سے سوال تھا۔

"میں وہی لڑکی ہوں جو آپ کے اسٹڈی روم کے باہر کھڑی رہتی تھی، جو آپ کے ساتھ بس چائے پیتی تھی، دل کا حال نہیں سنا پاتی تھی، بڑے باپ کا ساتھ، بڑے باپ کا وقت وہ بھی چاہتی تھی۔ اپنی سکول کی کامیابیاں شئیر کرنا چاہتی تھی۔ جو صرف ایک جملہ چاہتی تھی:

"I am proud of you."

میں نے پھول رکھے۔ پلٹی۔ اور جاتے ہوئے خاموشی سے کہا: "مگر ایسا نہ ہوا۔ وہ ہوا جو آپ کو پسند نہ تھا۔ صرف اس لیے جہاں آپ کھڑے تھے میں وہاں نہیں کھڑی تھی۔۔۔ کیونکہ آپ نے مجھے اُس جگہ کھڑا ہونا کبھی نہ سکھایا۔

افسوس۔۔۔ مگر یہ حقیقت ہے ابا۔۔۔ میں آپ کی بیٹی ہوں۔ آپ کے اس وطن میں آئی ہوں جسے آپ نے بنانے کی خاطر مجھے کھویا۔۔ اس لیے:

"Goodbye, Father...

Not Quaid."

چھپن برس بعد میں نے آخر کار اپنے باپ قائداعظم محمد علی جناح سے بات کر لی تھی۔

اور شاید یہی میری آزادی تھی۔

ثوبیہ نورین

بیٹوں اور بیٹیوں کی تربیت کے پوشیدہ پہلو

تربیت اولاد کے اہم ترین سلسلے کی یہ تیسری کڑی ہے۔ ہمیشہ کی طرح ثوبیہ نورین نے بہت سے اہم نکات اور پہلوؤں کی طرف توجہ دلائی ہے۔ عام طور پر ترقی پذیر معاشروں میں اسے نظر انداز کر دیا جاتا ہے۔

پچھلے مضامین میں ہم نے یہ واضح کرنے کی کوشش کی تھی کہ گھریلو تشدد، عدم برداشت، جذباتی جبر اور سماجی بے رحمی کے واقعات دیکھ کر چونک تو جاتے ہیں، مگر اکثر یہ سمجھ لیتے ہیں کہ یہ سب اچانک رونما ہو گئے۔ رشتہ دار، پڑوسی اور معاشرہ یوں محسوس کرتا ہے جیسے کسی دن ایک انسان نے یکدم انسانیت چھوڑ دی ہو۔

حالاں کہ حقیقت یہ ہے کہ ایسے انجام اچانک نہیں ہوتے۔ ان کی بنیاد بہت پہلے پڑ جاتی ہے—وہیں، جہاں ہم بچوں کی تربیت کے سنہری ابتدائی برس میاں بیوی، ساس بہو کے جھگڑوں یا گھریلو مصروفیات میں گزار دیتے ہیں، اور اگر کبھی فرصت مل بھی جائے تو تربیت کے حوالے سے بیداری پیدا نہیں ہو پاتی۔

ماں باپ بچے کی پیدائش سے پہلے ہی مختلف رویے اپنانا شروع کر دیتے ہیں۔ میرا یہ کہنا نہیں کہ یہ رویے لازماً منفی یا نفرت پر مبنی ہوتے ہیں، بلکہ محض یہ توجہ دلانا مقصود ہے کہ بیٹوں اور بیٹیوں کے پالنے پوسنے میں فرق موجود ہوتا ہے —جسے ہم محسوس تو کرتے ہیں، مگر اس کے اثرات پر غور نہیں کرتے۔

والدین، ماضی میں جھانکیں: چند ماہ کے بچے اور ہمارے انداز

نوزائیدہ بچوں کے نام اور جسمانی ساخت تو فطری طور پر مختلف ہوتے ہیں، مگر عقیقے کے بکرے، خوشی کی مٹھائیاں اور

اظہارِ مسرت کے پیمانے ہم خود متعین کرتے ہیں۔

پہلے ہی برس میں بچے اور بچی سے بات کرنے، اٹھانے، جھولے دینے اور مخاطب کرنے کے انداز میں فرق نمایاں ہو جاتا ہے، اور ہم اسے بڑے معصوم لہجے میں بیان بھی کرتے ہیں:

"اب تو گھر میں مرد آ گیا ہے۔"

"بیٹیاں تو بڑی نازک ہوتی ہیں۔"

یہی جملے حال ہی میں ایک ٹی وی شو میں ایک معروف اداکار کو نومولود بچوں کے جھولے جھلانے کے حوالے سے کہتے سنا۔ یہ سن کر ذہن میں کئی سوال ابھرتے ہیں:

کیا نومولود بچہ زیادہ طاقتور پیدا ہوتا ہے؟

کیا بچی کمزور یا کم معصوم ہوتی ہے؟

آخر یہ تفریق کس بنیاد پر؟

یہ فرق یہاں تک جا پہنچتا ہے کہ ڈائپر چینج کرتے وقت بھی حساسیت الگ ہو جاتی ہے، حالاں کہ اخلاقی اعتبار سے دونوں کے لیے تقاضا ایک ہی ہونا چاہیے۔ بظاہر یہ سب باتیں معمولی لگتی ہیں، اسی لیے موضوعِ بحث نہیں بنتیں، مگر یہ کب "بڑی" ہو جاتی ہیں—اس کا اندازہ بہت دیر سے ہوتا ہے۔

سوال یہ نہیں کہ ہماری نیت بری ہوتی ہے یا محبت میں کمی بیشی ہوتی ہے۔ اصل سوال یہ ہے کہ ہم محبت کس طرح کرتے ہیں، اور ہمارے رویے بچوں کو کون سے پوشیدہ پیغامات دیتے ہیں—جو ان کے مستقبل پر اثر انداز ہوتے ہیں۔

ابتدائی برس: جہاں فرق کا کوئی فطری جواز نہیں

زندگی کے ابتدائی برسوں میں لڑکے اور لڑکی کی نفسیات میں وہ فرق موجود ہی نہیں ہوتا جسے بنیاد بنا کر ہم تربیت کے اصول بدل دیتے ہیں۔ اس مرحلے پر بچہ محض بچہ ہوتا ہے—وہ کھیلنا، سوال کرنا، دریافت کرنا اور دنیا کو سمجھنا چاہتا ہے۔

مگر انہی بنیادی حقوق میں بھی بچیوں کے لیے مواقع محدود کر دیے جاتے ہیں، حالاں کہ اس عمر میں بچہ یہ شعور بھی نہیں رکھتا کہ اس کے ساتھ جو فرق روا رکھا جا رہا ہے وہ کس اہلیت یا بنیاد پر ہے۔

وہ رعایتیں جو نظر نہیں آتیں

لڑکوں کو کم عمری ہی میں ایسی رعایتیں ملنے لگتی ہیں جو ہمیں "معمول" محسوس ہوتی ہیں:

زیادہ دیر تک باہر رہنا،

ہر طرح کی اچھل کود،

کم جواب دہی،

زیادہ گنجائش اور کم روک ٹوک۔

یہ سب بظاہر چھوٹی باتیں ہیں، مگر تربیت میں کوئی چیز معمولی نہیں ہوتی۔ ہر رعایت، ہر چھوٹ ایک خاموش پیغام دیتی ہے—لڑکے کو بھی اور لڑکی کو بھی۔

یہ پیغام رفتہ رفتہ یہ شکل اختیار کر لیتا ہے کہ ایک جنس کی خواہش، آزادی اور مرضی دوسری سے زیادہ اہم ہے۔ یہاں سے کوئی فوراً ظالم نہیں بنتا، مگر ایک ایسا ذہن ضرور تشکیل پاتا ہے جو خود کو فطری طور پر برتر سمجھنے لگتا ہے۔

ہم دیکھتے ہیں کہ دینی پروگراموں میں یہ سوال زیرِ بحث آتا ہے کہ بیوی "بدتمیزی" کرے تو کیا مارا جا سکتا ہے، اور بحث اس بات پر ہوتی ہے کہ "کتنا" مارا جائے۔ مگر کوئی یہ نہیں پوچھتا کہ بدتمیزی کی تعریف کیا ہے؟ اور یہ مارنے کا اختیار کہاں سے آیا؟

کیا رائے دینا، جواب دینا، اپنے عمل کی وجہ بتانا یا عزتِ نفس کے لیے آواز اٹھانا بدتمیزی ہے؟

یہ معیار آخر کون طے کرے گا؟

یہی فکری کجی آگے چل کر گھریلو تشدد، ہراسمنٹ اور ریپ جیسے جرائم کو جنم دیتی ہے۔ اکثر کیسز کے پس منظر میں یہی سوچ ملتی ہے کہ عورت نے انکار کیوں کیا، باہر کیوں نکلی، اپنی مرضی کیوں کی؟

خوف کی بنیاد پر کی جانے والی تربیت

ہم ایک ایسے معاشرے میں رہتے ہیں جہاں کچھ انسان واقعی خطرہ ہیں، مگر سوال یہ ہے کہ اس خطرے کا بوجھ صرف بچیوں پر کیوں ڈال دیا جاتا ہے؟

اگر مسئلہ طاقت کا ہے تو طاقت کے اخلاقی استعمال کی تربیت کس کو ملنی چاہیے—طاقت رکھنے والے کو یا اس کا ہدف بننے والے کو؟

حفاظت اور نزاکت کے نام پر ہم بچیوں کو خوف میں پلا کر ایک کمزور، محتاج اور دب کر جینے والی نسل تیار کرتے ہیں، جب کہ لڑکوں کی تربیت سے ایک بنیادی عنصر غائب رہتا ہے:

طاقت کے ساتھ انصاف،

آزادی کے ساتھ ذمہ داری،

اور جذبات کے ساتھ ضبط۔

سیرتِ رسول ﷺ - تربیت کا اصل معیار

رسول اللہ ﷺ نے بچوں کے ساتھ نرمی، عدل اور برابری کا برتاؤ کیا۔ انہوں نے طاقت کو خوف نہیں، امانت بنایا۔ تربیت کو کبھی جبر یا تذلیل کا نام نہیں دیا۔

اگر ہم واقعی ان کے پیروکار ہیں تو ہمیں خود سے یہ سوال پوچھنا ہو گا:

کیا ہماری گھریلو تربیت اسی عدل، اسی نرمی اور اسی شعور کی عکاس ہے؟

شاید مسئلہ لڑکے اور لڑکی کا نہیں۔

شاید مسئلہ یہ ہے کہ ہم نے تربیت کو کنٹرول، اور ذمہ داری کو رعایت میں بدل دیا ہے۔

اور جب تربیت انصاف سے خالی ہو جائے تو جبر محض وقت کا کھیل رہ جاتا ہے۔

نظم

جاوید احمد غامدی

ماں

اس کی ہستی وجود کا محور
اس کی آغوش وسعت افلاک
اس کی صحبت تھی درد کا درماں
تلخی غم زہر کا تریاک

ظلمتوں کے ہجوم میں تاباں
ایک جبیں جس کی روشنی مہتاب
ہر بیاباں آسمان میں ڈھانپ لیتی تھی
ایک ردا جس میں رحمتوں کے سحاب

دشت و صحرا میں، لالہ و گل میں
صبر و ایثار کا وجود تمام

نظم

اس نے کلک وفا سے لکھا ہے
میری ہر راہ گزر پہ اپنا نام

اب اسی مہرباں کو روتا ہوں
خاک پر آسمان کو روتا ہوں

تبصرہ کتب

ابن فضل

خاتونِ اسلام

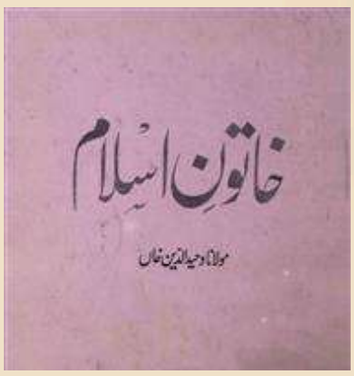

مصنف: مولانا وحید الدین خاں

صفحات: 286

سن اشاعت: 1994

قیمت: یہ کتاب پی ڈی ایف میں مفت دستیاب ہے

"خاتون اسلام" مولانا وحید الدین کی کتاب ہے جس میں اسلام میں عورت کے کردار اور حقوق کو بیان کیا گیا ہے۔ کتاب تین ابواب میں منقسم ہے جس میں پہلا باب میں معاشرہ میں عورت کا کردار، مشرقی عورت، مغربی عورت میں امتیاز، فطرت کا فیصلہ، دوسرے باب میں قران وحدیث میں عورت کا احترام، عورت کا درجہ، مومنہ کے صفات وغیرہ کا تفصیلی بیان ہے۔ باب سوم میں نکاح وطلاق، جہیز کے بارے میں، مہر کا مسئلہ، وغیرہ کی تفصیلات کے ذریعہ اسلام میں عورت کے اہم مقام ومرتبہ کو بیان کیا گیا ہے۔ کتاب کے مطالعے سے اسلام میں خواتین کی اہمیت واضح ہوتی ہے۔

یہ کتاب مصنف کی دیگر کتب میں خاص مقام کی حامل ہے۔ مولانا مودودی کی کتاب "پردہ" کے مقابلے میں اسے کئی اعتبار سے فوقیت حاصل ہے۔ اسلامی فکر میں عورت کے مقام اور اس کی حقیقی عظمت پر ایک سنجیدہ، مدلّل اور فکری مطالعہ ہے۔ اس کتاب میں مصنف نے عورت کو محض سماجی یا جذباتی موضوع کے طور پر نہیں بلکہ ایک باشعور، اخلاقی اور روحانی وجود کے طور پر پیش کیا ہے۔ مولانا کے نزدیک اسلام نے عورت کو نہ مغربی تہذیب کی طرح محض آزادی کا استعارہ بنایا ہے اور نہ مشرقی سماج کی طرح اسے ثانوی حیثیت میں رکھا ہے، بلکہ اسے وقار، ذمہ داری اور اخلاقی بلندی عطا کی ہے۔

تبصرہ کتب

کتاب میں قرآن و سنت کی روشنی میں عورت کے حقوق، اس کی ذمہ داریوں، خاندانی نظام میں اس کے کردار اور معاشرتی توازن میں اس کی اہمیت پر گفتگو کی گئی ہے۔ مولانا وحید الدین خاں جدید مغربی نسوانی تحریک اور روایتی مسلم معاشرت—دونوں کا تنقیدی جائزہ لیتے ہوئے یہ واضح کرتے ہیں کہ اسلام عورت کو مقابلے کی نہیں بلکہ تکمیلِ انسانیت کی علامت سمجھتا ہے۔ یہ کہنا بے جا نہ ہو گا یہ دراصل عورت کے بارے میں پھیلی ہوئی غلط فہمیوں کا فکری ازالہ ہے اور یہ پیغام دیتی ہے کہ عورت کی اصل عظمت اس کی اخلاقی قوت، صبر، شعور اور تعمیرِ انسان میں اس کے مثبت کردار میں مضمر ہے۔ یہ کتاب خاص طور پر ان قارئین کے لیے مفید ہے جو اسلام اور عورت کے موضوع کو سنجیدگی، توازن اور فکری گہرائی کے ساتھ سمجھنا چاہتے ہیں۔

تبصرہ فلم

دانش ابراہیم انصاری، فابیہ احسان

انگلش و نگلش

انگلش و نگلش (English Vinglish) ایک ہندوستانی فلم ہے جس کی انشاء پردازی اور ہدایت کاری (Writing & Direction) گوری شنڈے (Gauri Shinde) نے کی ہے۔ اِس فلم کا اجراء ۲۰۱۲ء میں ہوا اور اپنی نوعیت کے ایک نہایت مؤثر سماجی پیغام ہونے کے باعث دنیا بھر میں حد درجہ سراہا گیا۔ فلم کی مرکزی کردار ششی گوڈبولے (Shashi Godbole) کو مشہور و معروف اداکارہ شری دیوی (Sridevi) نے اس قدر فطری، دلکش اور مرغوبُ الطبع انداز میں نبھایا کہ یہ کردار ہر اس خاتون کی دل کی آماق سے اٹھی ہوئی آواز بن گیا جس کی حیثیت ہمارے خاندانوں اور معاشروں میں کسی صدا بَصحرا کی تھی۔

تبصرہ فلم

یہ محض کسی شخص کے انگریزی زبان سیکھنے کی داستان نہیں، بلکہ یہ ایک خاتونِ خانہ کی خودداری، خود افروزی اور خاموش مگر باوقار جدوجہد کی سرگزشت ہے۔ یہ فلم جدید خاندانی نظام میں عورت کے مقام، اس کے جذبات، احساسات اور گھریلو رویّوں پر لطیف مگر نہایت غائر سوالات اٹھاتی ہے۔

کہانی کی مرکزی کردار ششی گوڈبولے ایک سادہ لوح اور شریف النفس گھریلو خاتون ہے جو اپنے خاندان سے بے حد محبت کرتی ہے۔ وہ گھر کے تمام کام پوری دلجمعی اور حسن و خوبی سے انجام دیتی ہے — بچوں کی تعلیم و تربیت، اُن کی نگہداشت و پرداخت، اپنی ازدواجی زندگی میں ہر لحظے مفاہمت، موافقت اور معاونت، اور گھر کی غایت درجے عزت اور دیکھ بھال کا اہتمام اس کی اولین ترجیحات ہیں۔ اس کے باوجود ششی کا واحد شخصی "عیب" یہ سمجھا جاتا ہے کہ وہ فصیح و بلیغ انداز میں روانی اور سلاست کے ساتھ انگریزی نہیں بول سکتی۔

ششی کی یہ فرضی "نالائقی اور نااہلی" اس کے لیے طعن و تشنیع، تخفیف، تنقیص، تمسخر اور احساسِ کمتری کا موجب بن جاتی ہے۔ شوہر اور بچے نادانستہ طور پر اس کی باتوں پر ہنستے ہیں، گھریلو فیصلوں میں اسے سنجیدگی سے نہیں لیا جاتا، اور بتدریج ششی خود بھی اپنے آپ کو حقیر سمجھنے لگتی ہے۔

ششی کی یہ فرضی "نالائقی اور نااہلی" اس کے لیے طعن و تشنیع، تخفیف، تنقیص، تمسخر اور احساسِ کمتری کا موجب بن جاتی ہے۔ شوہر اور بچے نادانستہ طور پر اس کی باتوں پر ہنستے ہیں، گھریلو فیصلوں میں اسے سنجیدگی سے نہیں لیا جاتا، اور بتدریج ششی خود بھی اپنے آپ کو حقیر سمجھنے لگتی ہے۔

ایک موقع پر ششی کو اپنی بھانجی کی شادی میں شرکت کے لیے تنہا امریکہ جانا پڑتا ہے۔ یہ سفر اس کی زندگی کا ایک فیصلہ کن موڑ ثابت ہوتا ہے۔ وہاں ایک روز کسی cafe میں انگریزی نہ آنے کی وجہ سے اُسے ایک ذلت آمیز تجربے سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔ اس موقع پر محسوس کردہ رسوائی اور زبوں حالی، اسے اس قدر باطنی طور پر جھنجھوڑ کر رکھ دیتی ہے کہ وہ انگریزی سیکھنے کا فیصلہ کر لیتی ہے۔

وہ ایک مختصر مدت پر مبنی مکالماتی انگریزی نصاب (Spoken-English Course) میں داخلہ لیتی ہے، جہاں مختلف قومیتوں، ثقافتوں اور پس منظر سے تعلق رکھنے والے افراد اس کے ہم سبق بنتے ہیں۔ دورانِ دروس ششی کو پہلی مرتبہ اپنی انفرادیت اور شخصی خصلتوں کی وقعت، اہمیت اور اِفَادِیت کا حقیقی احساس ہوتا ہے۔

رفتہ رفتہ ششی نہ صرف انگریزی زبان سیکھتی ہے بلکہ اپنے اندر خود قدری، وثوق اور خود اعتمادی جیسے اوصاف کو بھی نَشوونُما دینے لگتی ہے۔ فلم اپنے نُقطۂ کمال اور ذرْوَہ پیغام پر تب پہنچتی ہے جب وہ اپنی بھانجی کی تقریبِ عروسی میں نوبیا

ہتا جوڑے کے لیے ایک مختصر مگر نہایت بامعنی اور ناصحانہ تقریر کرتی ہے — ایسے پر اثر کلمات جو اس کے اہلِ خانہ کو بھی آئینہ دکھا دیتے ہیں اور ناظرین کے قلوب و اذہان میں بھی ایک مثبت ارتعاش پیدا کرتے ہیں۔

فلم کے مرکزی اسباق

اس فلم کا لبِّ لُباب یہ ہے کہ کسی بھی فرد کی عزت کا معیار اس کی زبان دانی، تعلیمی اسناد یا معاشی کمالات نہیں، بلکہ اس کا انسانی وقار ہے۔ ایک گھریلو خاتون بھی اتنی ہی قابلِ احترام ہے جتنا کوئی کاروباری یا پیشہ ور شخص۔ ششی کی زندگی اس بات کی یاد دہانی ہے کہ گھر داری بھی ایک اہم ترین ذمہ داری ہے، نہ کہ کسی لاچارگی، پشیمانی یا سماجی ضعف کی علامت۔

1۔ مسلسل تضحیک، غیر سنجیدگی اور احترازی کا رویہ بتدریج انسان کے شخصیت میں محاسن کے قصر کو منہدم کر دیتا ہے۔ ششی پر کسی طرح کا کوئی سبّ و شتم، تشدّد یا ظلم کا ارتکاب نہیں ہوتا، مگر اس کی توہین، طنز و مزاح کے لبادے میں ہوتی ہے۔ فلم یہ واضح کرتی ہے کہ جذباتی محرومی (emotional neglect) بھی ایک گہرا زخم ہوتا ہے، جو کسی لکڑی پر دیمک کے مانند خود اعتمادی کو نجمًا نجمًا اختتام پذیری کی طرف دھکیلتا ہے۔

ششی کا یہ قابل ستائش سفر ہمیں یہ سبق دیتا ہے کہ سیکھنے کی کوئی عمر نہیں ہوتی۔

There is no age limit for learning. If you have the willingness and the correct attitude to learn something, age becomes just a number.

تعلیم صرف اقتصادی کارکردگی کو بروئے کار لانے یا اپنی حیثیت عرفی کی افزونی کے لیے نہیں، بلکہ اپنی خودی کے شعوری ادراک کے لیے بھی ضروری ہوتی ہے۔ عورت اگر پورے عزم و استقلال کے ساتھ چاہے تو مابعدِ نکاح، اپنے شوہر، بچوں اور گھریلو ذمہ داریوں کے باوصف اس راہِ محمود کی مسافر بن سکتی ہے۔

2۔ فلم ہر فردِ خاندان کو یہ اہم سبق دیتی ہے کہ عورت کا سب سے پہلا سماجی دائرہ (social circle) اس کا گھر ہوتا ہے۔ اگر وہیں اسے وہ مطلوبہ عزت و اکرام نہ ملے تو دنیا کی تمام توصیف و تحسین بھی اس خلا کو پُر نہیں کر سکتی۔ شوہر اور بچوں کے الفاظ، لہجہ اور رویہ عورت کی شخصیت کو یا تو بنیانِ مرصوص کی سی تقویت عطا کرتے ہیں یا پھر اس کی خود شناسی کو آخری درجے میں معدوم و مجروح کر دیتے ہیں۔

3۔ ششی نہ کسی طرح کا کوئی تصادم یا مخاصمانہ رویہ اختیار کرتی ہے، نہ شکوہ شکایت یا لعنت ملامت کے راستے پر گامزن ہوتی ہے، اور نہ ہی کسی کی تذلیل و تحقیر جیسے شنیع عمل میں مبتلا ہوتی ہے۔ اس کے برعکس، وہ ذاتی فراغ

بالی اور ارتقا پذیری کو اپنانا گُزیر ہدف و نصب العین قرار دیتی ہے۔ یہی اس فلم کی سب سے بڑی خصوصیت ہے۔ یہ ہمیں سکھاتی ہے کہ حقیقی تبدیلی شورش بپا کرنے یا شدید ردِ عمل کی نفسیات میں مبتلا ہونے سے نہیں، بلکہ کدّو کاوش، مستقل مزاجی اور ثابت قدمی کو اپنا وَتیرَہ بنانے سے آتی ہے۔